

## راہ نجات

مسجد کو مرکز بنا کر اخلاقی، معاشی اور سماجی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے

دینی قوتیں غور فرمائیں

پاکستان میں بحرانی کیفیت، درپیش شدید مسائل اور ممکنہ حل کے لیے ہم نے سطور سابقہ میں کھل کر بات کی ہے۔ ہمارے لیے اہم ترین بات یہ ہے کہ پاکستان امن وامان سے اس آزمائش کے دور سے گزر جائے اور بالآخر یہاں اسلامی نظام قائم ہو جائے اور احیائے اسلام کا کام شروع ہو جو یقیناً ہر کس و ناکس، مسلمان ہو یا غیر مسلم، حیوانات ہوں کہ نباتات، حتیٰ کہ جمادات سب کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔

ہم یہ بات بھی کہہ ہیں کہ اگرچہ پاکستان کی تخلیق کے پیچھے نعرہ توحید پاکستان کا مطلب کیا..... لا الہ الا اللہ، تھا لیکن اپنے بچپن ہی میں یہ اللہ پرستوں کی بجائے مفاد پرست ٹولہ کے ہاتھ چڑھ گیا۔ اس وقت سے ٹریجڈی یہ ہے کہ اسلام دشمن قوتیں یہ پراپیگنڈا بڑی کامیابی سے کر رہی ہیں کہ اسلامی نظام حکومت کا مطلب مولوی کی وحشت ناک حکومت ہوگا جس میں سختی ہی سختی ہوگی اور یہ آپس میں دنگا فساد کریں گے۔ یوں ملک ہمیشہ فتنہ و فساد کا شکار ہو جائے گا۔ بظاہر فرقہ پسندی کی فضا میں اس بات میں کچھ وزن بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اس ملک کے ۹۷ فیصد لوگ مسلمان ہیں اور علماء جمعہ کے بڑے بڑے اجتماعات سے بھی ہفتہ وار خطاب کرتے رہتے ہیں، تبلیغی جماعت بھی لاکھوں لوگوں کے اجتماعات اکٹھے کر لیتی ہے لیکن اسلامی جماعتیں الیکشن میں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔

جس فیصلہ کن موڑ پر اب پاکستان پہنچ چکا ہے، اگر اسلام پسند چاہتے ہیں کہ یہ ملک قائم رہے اور اسلامی حیثیت سے قائم رہے تو نہایت دانشمندانہ لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے چاہیے کہ پاکستانی سیاسی رہنما، علماء، صوفیاء کرام، افواج پاکستان کے ذمہ داران، ملک کے تجربہ کار دانشور اور ان کے علاوہ

☆ ایٹمی سائنسدان و انجینئر (ستارہ امتیاز) دارالحکومت انٹرنیشنل، ناظم الدین روڈ، F-8/4، اسلام آباد

☆ سلطان بشیر محمود صاحب نے اسلامی تناظر میں پاکستانی معاشرے کے مسائل کے حل کے لیے 'راہ نجات' کے نام سے ایک پمفلٹ لکھا ہے اس کا ایک حصہ جولاٹھ عمل کے عنوان سے ہے، معمولی تہذیب کے بعد یہاں دیا جا رہا ہے۔ مذکورہ پمفلٹ خط لکھ کر ان سے بلا معاوضہ منگوا یا جاسکتا ہے۔

پاکستان کے ہر طبقہ کے چیدہ چیدہ نمائندے خصوصاً اسلام پسند مل کر بیٹھیں اور بیٹھیں رہیں تا وقتیکہ وہ غور و فکر کے بعد بالاتفاق کسی مثبت فیصلہ پر نہ پہنچ جائیں۔

اس ضمن میں، میں کسی دانشمندی کا دعویدار تو نہیں ہوں لیکن ایک فکر مند پاکستانی کی حیثیت سے چند تجاویز آپ کی توجہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

۱- احیائے اسلام کی بات ہو یا مسلمانوں کی ترقی کی، میرے نزدیک احیائے مساجد مرکزی نقطہ ہے۔ تاریخ اسلام اس بات کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ پاکستان میں لا الہ الا اللہ کا نظام نہیں آسکا اُس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسلامی جماعتوں کا مساجد سے جس طرح کا تعلق ہونا چاہیے تھا ایسا نہیں ہوا۔ اصلاح احوال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہفتہ وار ہر جمعہ کو مسلمانوں کے اجتماعات کا بندوبست کیا ہے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

افسوس یہ ہے کہ مساجد اتحاد کا منبع ہونے کی بجائے مسلمانوں کی باہمی تقسیم کا باعث بنا دی گئی ہیں حتیٰ کہ مساجد کے نام اور اُن کی پہچان مختلف فرقوں کے اعتبار سے ہوتی ہے یعنی مسجد اہل حدیث، مسجد اہل سنت وغیرہ وغیرہ۔ اگر اسلام پسند لوگ واقعی اپنی پسند میں مخلص ہیں تو پہلا قدم مسجدوں کو فرقہ بندی سے پاک کرنے کا ہوگا۔ یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں اس لیے ان کے نام بدل کر اسماء الحسنی جل جلالہ پر رکھے جائیں۔ مثلاً مسجد الرحمن، مسجد الرحیم، مسجد الصبور، مسجد العلم وغیرہ وغیرہ تاکہ مسجد سے فرقہ بندی کی بُن نہ آئے۔

۲- احیائے مساجد کے لیے مسجد کے امام صاحب کے مقام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جب تک امام مسجد کو امام (لیڈر، رہنما) کی سی عزت نہیں ملتی، احیائے مساجد اور احیائے اسلام ناممکن ہے۔ اسی لیے بے دین طبقہ نے مولوی صاحب کے متعلق ایک ظالمانہ غلط تصور پیدا کیا ہے جس نے امام مسجد کی عزت اور اہمیت کو ختم کر دیا۔ ان غلط اثرات کو دور کرنا بہت ضروری ہے اور اس پر فوری عمل ہونا چاہیے کیونکہ امام مسجد اسلام کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ اپنے معاشرہ میں دین کا لیڈر ہے۔ اُسے اپنے علاقہ کا لیڈر بھی ہونا چاہیے۔ اسلام کے دعویداروں کو چاہیے کہ اُن کے بارے میں محبت، خلوص، پیار، عاجزی کی بجائے جو سختی، ضدی اور جاہل ہونے کا تصور پیدا کیا گیا ہے اُسے عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ وہ غلط ہے۔ یہ مذموم پراپیگنڈا اسلام دشمن لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ امام مسجد خود خدمت کا پیکر بن کر لوگوں کے سامنے آئیں اور اپنے خطبات میں اُن مسائل کی بات کریں جن کی وجہ سے عوام پریشان ہیں، تاکہ وہ اور عوام ایک ہی سوچ کے

ہو جائیں۔

۳۔ پرائمری تعلیم کا نظام مساجد میں لایا جائے۔ علماء اور مساجد کی انتظامی کمیٹیوں کو چاہیے کہ ہر مسجد میں فجر کی نماز سے ظہر کی نماز تک پرائمری سکول کھول دیا جائے تاکہ پاکستان کا کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے اور پاکستانی نوجوان اپنی بچپن ہی سے مسجد کی فضاء میں تربیت پائیں۔

۴۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ **اَللّٰہُ اَكْبَرُ** نافذ کرنے کے لیے جہاں جہاں آئین میں تبدیلی کی ضرورت ہے، اتفاق رائے سے اُس کی اصلاح کی جائے۔ اگلے الیکشن میں یہ بنیادی ایٹو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے علماء حضرات مساجد سے اور نوجوان کالجوں سے آواز اٹھا کر عوام کو قائل کریں۔

۵۔ عوام مہنگائی اور حکمرانوں کی شاہ خرچیوں سے تنگ ہیں۔ اسی طرح امن و امان اُن کی ضرورت ہے۔ انہیں روزگار چاہیے اور تھانہ کلچر سے نجات چاہیے۔ غرض عوام کے بے شمار مسائل ہیں جن کی حمایت میں جمعہ کے خطبات میں بات ہونی چاہیے اور مساجد سے رہنمائی ملنا چاہیے تاکہ عوام کو احساس ہو کہ مسجدوں میں جو بیٹھے ہیں انہیں نہ صرف ہماری آخرت کی فکر ہے بلکہ ہمارے دنیاوی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی وہ بیتاب ہیں۔

۶۔ پاکستان کے اندر کسی بیرونی مداخلت کو برداشت نہ کیا جائے۔ مسلمان ممالک کے ساتھ گہرے برادرانہ تعلقات استوار کرنے کی بھرپور کوششیں کی جائیں۔ مسلمان ممالک کو پاکستان میں انویسٹمنٹ کے لیے تیار کیا جائے۔ پاکستانی شہریت کو حاصل کرنا غیر پاکستانی مسلمانوں کے لیے آسان بنایا جائے۔

۷۔ جہاں تک معاشی بحران کا تعلق ہے ہم بتا چکے ہیں کہ اس کا واحد حل 'میڈان پاکستان' (Made in Pakistan) میں ہے، مساجد سے خود انحصاری کے حق میں آواز اٹھنا چاہیے کہ صرف پاکستان کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کیا جائے اور غیر ملکی مصنوعات کا مکمل حد تک بائیکاٹ کیا جائے تاکہ پاکستان کی انڈسٹری کا پیہ چل نکلے اور غریب مزدوروں کو دوبارہ روزگار مل جائے۔

۸۔ پاکستان کے معاشی حالات کو بدلنے کے لیے پاکستان کا بجٹ بیرونی قرضوں اور غیر ملکی امداد کی بجائے خود انحصاری کی بناء پر بنایا جائے۔ حکمرانوں کی شاہ خرچیوں کو پورا کرنے کے لیے بجٹ میں بے حساب دولت رکھی جاتی ہے اور عوام کو صرف ۱۵-۱۶ فیصد مزید مہنگائی کی نوید سنائی جاتی ہے۔ ایسے بجٹوں کو رد کر دیا جائے اور اُن کے خلاف مساجد سے احتجاج کیے جائیں اور ایسے بجٹ کا مطالبہ کیا جائے جس میں پاکستان کے غریب عوام کے مسائل کا فوری حل ہو اور روزگار کو بھی یقیناً

بنایا جائے۔

۹- یکے بعد دیگرے پاکستانی حکومتیں دھڑا دھڑا قرضے لے رہی ہیں۔ انہوں نے مستقبل میں پیدا ہونے والے ہمارے بچوں کو بھی بے حساب مقروض کر دیا ہے۔ اس مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام پسندوں کو چاہیے کہ وہ قرض لینے کی پالیسی کو رد کریں۔ سودی نظام، غیر ملکی قرضے اور امداد کو جو کہ ایک بہت بڑا دھوکہ اور فراڈ ہیں، اُن کے خلاف بھرپور احتجاج کریں اور عملی خود انحصاری کے لیے حکومت، عوام اور صنعت کاروں کو مجبور کریں۔

۱۰- سودی نظام کے خلاف اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی جاری جنگ کا ساتھ دیں۔ بنکوں کا نظام بطور امانت دار صحیح اسلامی رُوح کے مطابق تبدیل کیا جائے۔ مساجد میں باہمی معاشی اور انتظامی امداد کی سرپرستی کے لیے کمیٹیاں بنائی جائیں تاکہ روزگار کے مواقع پیدا ہوں۔

۱۱- اسلام پسند عوام اس مطالبہ کے حق میں بھی سخت احتجاج کریں کہ وہ سیاسی اور غیر سیاسی لوگ جنہوں نے اپنے اکاؤنٹ باہر کے ممالک میں رکھے ہیں وہ اپنا پیسہ اپنے ملک میں واپس لائیں ورنہ اس سرزمین کو چھوڑ کو وہاں چلے جائیں جہاں انہوں نے اپنی دولت چھپائی ہے۔

۱۲- وہ لوگ جن کے بیرونی ممالک میں اکاؤنٹ، کوٹھیاں، محلات اور جائیدادیں ہیں اور یہ بھی کہ پاکستان کے علاوہ جن کے پاس پاکستانی شہریت کے ساتھ کسی دوسرے ممالک کی شہریت بھی ہو انہیں پاکستان میں کسی سرکاری عہدہ اور کسی عوامی اسمبلی کے لیے الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔

۱۳- پاکستان میں اکثر جاگیرداروں، سجادہ نشینوں اور نوابزادوں کا کردار غریب کو غریب تر اور جاہل رکھنے کا رہا ہے۔ انہیں جاگیریں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے ملی تھیں۔ غداری سے لی گئی یہ جائیدادیں بحق عوام ضبط ہو جانی چاہئیں۔ اسلام پسندوں کو چاہیے کہ اس مسئلہ کو عوامی اور حکومتی عدالتوں میں لے کر جائیں تاکہ حقداروں کا حق اُن تک پہنچ جائے۔

۱۴- قرآن کریم میں بار بار مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ مشرکین، یہودی، عیسائی اور اسلام دشمنوں سے دوستی نہ کریں۔ اُن سے دنیاوی کام چلانے کے لیے معاہدے تو ہو سکتے ہیں لیکن غیر مسلموں کے اوپر انحصار اور اُن سے دوستانہ مراسم بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ ہمیں اجازت نہیں دیتے۔ ہماری دوستی اور برادرانہ تعلق انفرادی سطح پر ہو یا ملکی سطح پر، مسلمانوں سے ہی حلال ہے۔ مساجد سے چاہیے کہ غیر مسلم طاقتوں سے دوستی کا دعویٰ اور اُن کی ناز برادریاں اُٹھانے کے خلاف احتجاج ہوتا رہے۔ مسلم اُمہ کا تصور اُجاگر کرنے کے لیے اسلامی ممالک کے

ساتھ تعلقات شروع کیے جائیں۔ پاکستانی یونیورسٹیوں میں مسلم ممالک کے طلباء کو فری داخلے دیے جائیں۔ صوبوں کی سطح پر غریب طلباء کے لیے تعلیمی وظائف دینے کا سلسلہ شروع ہوتا کہ جو پڑھنے کے لائق ہے اُسے ضرور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔

۱۵- سادگی کے حق میں اور فضول خرچی کے خلاف بولا جائے اور حکومتی اداروں کو شاہ خرچیوں سے روکنے کے لیے احتجاجی کوششیں جاری رہیں۔ دفتروں میں ایئر کنڈیشن کے استعمال کو کم سے کم کیا جائے۔ فضول دوروں پر، خواہ وہ صدر کے ہوں یا وزیراعظم کے، پابندی ہونی چاہیے۔

۱۶- تاجروں، صنعت کاروں، زمینداروں اور افسران حکومت سے اپیل کی جائے اور انہیں قائل کیا جائے کہ ملک بچانے کے لیے اپنی آمدنی کا کم از کم ۲۰ فیصد، ۷ سال کے لیے بلا سود پاکستان کو قرض دیں تاکہ عوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے رقم فراہم ہو۔

۱۷- بینکوں میں لوگوں کا جو سونا، چاندی جمع ہے وہ پاکستان کو دس سالوں کے لیے قرض دیا جائے تاکہ غیر ملکی قرضوں سے نجات حاصل کی جائے۔

۱۸- ملک کی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر محنت کار کو اپیل کی جائے اور قائل کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک گھنٹہ اپنے ملک کی خاطر زیادہ کام کرے۔

۱۹- پاکستان میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور محل بنانے کا جو رواج چل پڑا ہے۔ اُس پر پابندی لگائی جائے اور ایک کنال (۲۰ مرلہ) سے زیادہ کا کوئی رہائشی پلاٹ نہ بنایا جائے۔

۲۰- اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا معیار بڑھایا جائے تاکہ ہر یونیورسٹی مرکز تحقیق بھی ہو۔

۲۱- تمام منصوبوں میں خود انحصاری کی پالیسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

یہ چند گزارشات اور تجاویز ہیں جو میں اپنے علماء اور دانشوروں کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ وہ کوئی عملی جدوجہد شروع کریں۔ خالی خولی بات چیت بہت ہو چکی۔ پاکستان کے پاس لفاظی اور تبصروں کا وقت نہیں رہا۔ تاریخ عالم میں جب بھی مسلمانوں پر کوئی بُرا وقت آیا تو اسلام نے آگے بڑھ کر انہیں گرنے سے بچا لیا۔ ان شاء اللہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام ہمیں بچائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب پاکستانی اپنی غلطیوں کی طرف توجہ کریں گے اور راہِ راست پر آنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور اُن کی مدد کے لیے اپنے فرشتے بھیجے گا۔ آئیے، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے عملی طور پر فتنہ و فساد روکنے کے لیے آواز بلند کریں بلکہ اپنی قوت کا بھی مظاہرہ کریں تاکہ دشمنوں کے دلوں پر آپ کا رعب پڑ جائے۔

## احیائے مساجد اور روحانی خلافت کے متعلق اقدامات

مُسلم اُمّہ کا وجود زمین پر مسجد سے لازم و ملزوم ہے جس کا آئیڈیل رسول اکرم ﷺ کے زمانے اور خلافت راشدہ کے دور میں مسجد نبوی تھی۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی اور روحانی طاقت کا سرچشمہ تھی اور یوں پوری اُمّت کا دار الخلافہ تھی۔ اسی نمونہ پر صوبوں کے صدر مقامات کی مسجدیں تھیں۔ یوں اپنی اپنی سطح پر ہر ایک مسجد خلافت کے نظام کی قائم مقام تھی لیکن دھیرے دھیرے مساجد کی یہ پہچان اور شان قصرِ صدارت میں منتقل ہو گئی۔ مساجد کا نظام کمزور ہوتا گیا اور نتیجتاً اسلام کی قوت بھی کمزور ہوتی گئی۔ بالآخر دوسرے مذاہب کے پوجا پاٹ کے گھروں کی طرح ہماری مسجدیں بھی فرقہ بازی کی بنیاد پر محض عبادت خانے بن کر رہ گئیں اور اب زیادہ تر مسلمانوں کے اتحاد کی بجائے باہمی تفریق کی جگہیں ہیں۔ اگر ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ چاہتے ہیں تو مسلم معاشروں میں مساجد کو نبی پاک ﷺ کی مسجد کے نمونہ کو سامنے رکھ کر مرکز کی کردار واپس دلانا ہوگا۔

کچھ لوگ مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں کہ علماء میں فرقہ بازی کی وجہ سے شاید یہ تجویز کامیاب نہ ہو، لیکن ان کی یہ مایوسی اس کے اسلامی پہلوؤں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ اس میں سنت نبوی ﷺ کا احیاء ہے اور کوئی بھی فرقہ سنت کے خلاف نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی کامیابی میں امام مسجد اور مسجد کمیٹیوں کی عزت ہے۔ لوگ بھی جب معاشرتی زندگی میں مساجد کے بڑھتے ہوئے فوائد کو دیکھیں گے تو اس کی حمایت کریں گے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اگر یہ تجربہ چند ایک مساجد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بات خود بخود آگے بڑھنے لگے گی۔

اس لیے اسلام کے احیاء کی طرف پہلے عملی قدم کے طور پر مسجد کے احیاء پر کام شروع ہونا چاہیے۔ کچھ نہیں تو ہر مسجد کی مجلس شوریٰ (مسجد کمیٹی) کے زیر انتظام مندرجہ ذیل اقدامات تو ضروری ہیں تاکہ یہاں سے نکلنے والے نور سے شہر کے سب گھر منور ہو جائیں اور مسجد مسلمانوں کی سماجی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرے۔

۱۔ نظامِ صلوٰۃ کا قیام: مساجد میں چٹگانہ زندہ نماز قائم کی جائے جیسے نماز قائم کرنے کا حق ہے۔ تعلیم بالغاں کا انتظام ہو جہاں لوگ قرآن کریم، احادیث، سیرت طیبہ، اسلامی تاریخ اور دنیا پر اسلام کی برکات کے متعلق تعلیم سیکھیں۔ نمازی نماز کی اصل روح سے آشنا ہوں اور مسجد سے حاصل کردہ نور کا خزانہ اپنے گھروں کو بھی پہنچائیں تاکہ صلوٰۃ کے نتیجے میں معاشرہ مری باتوں اور فواحش سے پاک ہو جائے۔

۲۔ نظامِ زکوٰۃ کا قیام: ہر مسجد میں بیت المال کھولا جانا چاہیے جہاں لوگ اپنی زکوٰۃ، صدقات

اور امانتیں جمع کرائیں جو اسلامی حکم کے مطابق تقسیم ہوں، تاکہ حق داروں تک اُن کا حق پہنچ جائے اور مساکین، فقراء اور یتامی کو مناسب مدد دی جاسکے۔

۳- ابتدائی تعلیم کے نظام کا قیام: ہر مسجد میں قرآن کریم اور اسلام کی دیگر تعلیمات کے علاوہ حکومتی نصاب کے مطابق مسجد کی مجلس شوریٰ کے زیر انتظام اعلیٰ معیاری پرائمری تعلیم کے لیے مکتب کھولے جائیں تاکہ کوئی بچہ پڑھنے لکھنے سے محروم نہ رہ جائے۔ اس طرح بچے اپنے بچپن ہی سے مسجد سے جُڑ جائیں گے اور وہ پرائمری سکول کی تعلیم ختم ہونے تک قرآن کریم اور اسلام کے ضروری مسائل اور اعمال سیکھ چکے ہوں۔

۴- بنیادی نظام عدل کا قیام: لوگ اپنے باہمی جھگڑے اور دیگر مسائل مسجد کی مجلس شوریٰ کے پاس لے کر آئیں اور مسجد کے اسلامی ماحول میں اپنے اختلافات اور معاملات حل کریں یعنی مسجد علاقہ کی پنچایت گھر بھی ہو جہاں مظلوم کی دادی ہو سکے۔

۵- حفظانِ صحت کے نظام کا قیام: ہر مسجد میں روحانی علاج کے علاوہ اسلامی طب کے مطابق جسمانی علاج کا انتظام بھی ہو۔ لوگوں کے علاج معالجہ کے لیے ڈپنسریاں کھولی جائیں جہاں غریبوں کا ۲۴ گھنٹے مفت علاج ہو۔ بہتر ہوگا اسلام کے درخشندہ ماضی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے علماء اسلامی طب کے بھی ماہر ہوں تو وہ خود نمازوں کے اوقات کے علاوہ مسجد سے ملحقہ مطب کھول کر دین و دنیا کی مزید خدمت کر سکتے ہیں۔

۶- اصلاحِ معاشرہ کے نظام کا قیام: اسلامی فقہ میں لوگوں کی رہنمائی کی جائے اور اصلاح کی غرض سے عملی طور پر حکمت سے معاشرہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کوششیں کی جائیں۔

۷- نظامِ معاش کا قیام: مسجد سے بے روزگاروں کو قرضِ حسنہ دیئے جائیں۔ قرضِ حسنہ کے لیے لوگوں کے پاس فالتو پیسے ہوں گے جو وہ بطور امانت اسی مقصد کے لیے مجلس شوریٰ کے پاس جمع کرائیں۔ اگر کسی مسجد کا مدرسہ ہو تو مسجد کمیٹی کے زیر انتظام حلال اور حرام، پاک اور ناپاک کی تمیز کرتے ہوئے خوراک کے شعبہ کے متعلق کاروبار کیا جانا چاہیے۔ مثلاً بیکری، تاکہ معاشرہ کو وہاں سے پاکیزہ خوراک ملے اور مسجد کی اپنی بھی کچھ آمدنی ہو۔ مزید یہ کہ مدرسہ کے طلباء وہاں سے عملی کاروبار کرنے کی ٹریننگ بھی حاصل کر سکیں۔

۸- خواتین کی مساجد میں حاضری: جیسے خاتم النبیین، رحمت اللعالمین ﷺ کی مسجد میں پنجگانہ نماز میں مُسلم خواتین حصہ لیتی تھیں، آج بھی خواتین اور بچوں کو مسجدوں میں واپس لانے کے لیے

تلقین کی جائے تاکہ سارے کے سارے مسلم معاشرہ کا مسجد سے مضبوط تعلق قائم ہو جائے۔

مندرجہ بالا اقدامات سے مساجد معاشرہ کی زندگی میں ایک با اثر مرکزی مقام حاصل کر لیں گی، اس سے امام صاحب اور مسجد کمیٹیوں کے ارکان کو بھی وہ عزت ملے گی جس کے وہ حقدار ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُمہ کی سطح پر اسلامی نظام خلافت قائم کرنے کی ابتداء ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے اس نظام کے پھیلنے اور مضبوط ہونے میں کچھ وقت لگ جائے لیکن اس کے مقامی طور پر جو فوائد ہیں ان سے معاشرہ فوری فیض یاب ہونے لگے گا۔

میں برسوں کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ حالات میں اگر آپ مسلم اُمہ میں خلافت کا احیاء چاہتے ہیں تو اس کی بنیادی اینٹ مسجد ہی ہو سکتی ہے۔ جب یہ بنیادی اینٹیں باہم لگنا شروع ہوں گی تو روحانی خلافت کی عمارت کھڑی ہونے لگے گی۔ روحانی خلافت کے نظریہ سے میں سیاسی خلافت کی نفی نہیں کر رہا ہوں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں نسبتاً آسانی سے کون سا کام ہو سکتا ہے اور یوں درجہ بدرجہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کو کیسے پایا جاسکتا ہے؟ اُس کے لیے بغیر کسی بڑی چپقلش کے سیدھا طریقہ یہی نظر آتا ہے۔

اس نظام میں اپنی اپنی جگہ پر ہر مسجد ایک مٹی خلافت گاہ ہوگی۔ یوں جیسے جیسے مساجد میں خلافت کا بنیادی نظام قائم ہوتا جائے گا اور وہ آپس میں منسلک ہوتی جائیں گی اور دھیرے دھیرے یہ اپنی مجموعی شکل میں بھی نظر آنے لگے گا۔ محلہ جاتی مسجدوں کے تعاون سے پورے شہر میں روحانی خلافت کا مرکز سب سے بڑی جامع مسجد ہوگی۔ اسی طرح یہ سلسلہ بڑھتے ہوئے ضلع، صوبہ، ملک اور پوری دنیا میں پھیل سکتا ہے۔ ان شاء اللہ۔ پھر مسلمانوں کا دُنیا بھر میں ایک روحانی خلیفہ ہوگا جو مساجد کی عالمی تنظیم کا سربراہ ہوگا اور یوں مسلمانوں کا روحانی رہنما ہوگا۔ مساجد کا یہ عالمی الحاق مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی علامت، اسلام کی عالمی تبلیغ اور مسلم اقلیتوں کے حقوق کے دفاع میں اہم کردار کر سکے گا۔

معزز قارئین! مندرجہ بالا تجاویز مسائل سے خالی نہیں لیکن ایسا کون سا منصوبہ ہے جس میں کوئی مسئلہ نہ ہو؟ ان شاء اللہ! نیت صاف ہو تو ہر مسئلہ کا حل بھی نکل آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں کچھ علماء اپنی مخصوص وجوہات کی وجہ سے مسجد کو خلافت کی پہلی منزل بنانے سے متفق نہ ہوں لیکن مجھے اُمید ہے کہ جب وہ غور فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ اُن کی اپنی عزت اور بقاء بھی اس مجوزہ نظام سے بہتر کسی اور نظام میں نہیں۔ ابتداء میں مشکلات ضرور پیش آئیں گی لیکن اگر آپ ایک مسجد میں یہ تجربہ کامیاب کر لیتے ہیں تو اس کے فوائد دیکھتے ہوئے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ آپ سے فاستقبوا الخیرات نیکی میں جلدی کرو کی درخواست ہے۔



## تزکیہ نفس - چند بنیادی مباحث

(سوالاً جواباً)

**سوال:** تزکیہ نفس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

**جواب:** اسلام میں تزکیہ نفس سے مراد ہے انسانی شخصیت کی ایسی نشوونما جس میں وہ، وہ سارے اچھے کام کر سکے جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان سب برے کاموں سے بچ سکے جن سے اللہ نے بچنے کا حکم دیا ہے۔ انسانی شخصیت سے مراد یہاں مکمل انسانی شخصیت ہے یعنی انسان کا جسم و روح، فکر و عمل، جبلتیں، عواطف و جذبات، تعقل، نفسی محرکات، عادتیں وغیرہ۔

**سوال:** اسلام میں تزکیہ نفس کی کیا اہمیت ہے؟

**جواب:** تزکیہ نفس اسلام کی بنیاد ہے چنانچہ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں بھیجے تھے ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریں تاکہ لوگ اسلام قبول کریں اور اس کے احکام پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کریں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سنواریں۔ قرآن حکیم میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو بھی اسی لیے مبعوث فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کا تزکیہ نفس کریں۔

**سوال:** کیا شریعت تزکیہ نفس کے لیے کافی ہے؟

**جواب:** اللہ تعالیٰ جو ہدایت اور دین اپنے پیغمبروں کے ذریعے نازل فرماتا رہا ہے اور جو دین اور شریعت اس نے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمائی وہ بنی نوع انسان کی ہدایت اور ان کے نفوس کے تزکیے کے لیے یقیناً کافی و شافی ہے۔

**سوال:** شریعت انسان کا تزکیہ کس طرح کرتی ہے؟

**جواب:** اس دنیا میں انسان تین طرح کے تعلقات رکھتا ہے اور انہی پر اس کی ساری زندگی کے اعمال و افعال محیط ہیں۔ ایک: انسان کا تعلق اس کے خالق کے ساتھ۔ دوسرے اس کا تعلق دوسرے بنی نوع انسان کے ساتھ اور تیسرے اس کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ۔ ان تینوں قسموں کے تعلقات میں اگر انسان کو اپنے حقوق و فرائض کا پتہ چل جائے اور وہ ان پر ٹھیک طریقے سے عمل پیرا ہو جائے تو اس کے

نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح شریعت (یعنی احکام دین) کو بالعموم چار بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک: ایمانیات، دوسرے: عبادات، تیسرے: اخلاقیات اور چوتھے: معاملات۔ ان چاروں شعبوں میں دی گئی شرعی تعلیمات پر اگر صحیح طریقے سے عمل کیا جائے تو انسانی تعلقات کے مٹیوں مذکورہ ابعاد پر اس توازن سے عمل ہو جاتا ہے کہ ایک متوازن اسلامی شخصیت وجود میں آ جاتی ہے جو کہ تزکیہ نفس کا حقیقی مطلوب ہے۔

**سوال:** اصولاً آپ کی بات ٹھیک لگتی ہے لیکن واضح نہیں ہوئی۔

**جواب:** وضاحت کے لیے ہمیں ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا اور ایک ایک شعبے کی کارکردگی کا ذکر کرنا پڑے گا۔ ایمانیات ان نظریات و عقائد کو کہتے ہیں جن پر ایک انسان ایمان لاتا اور پختہ یقین رکھتا ہے۔ جتنا پختہ ایک انسان کا یقین ہوگا اتنا ہی یہ ایمانیات اس کے فکر و عمل کی بنیاد بنیں گے اور جس قسم کے یہ ایمانیات ہوں گے اسی قسم کی اس کی شخصیت بنے گی۔ مثلاً اسلامی ایمانیات کا ایک جز و توحید ہے جس کا ایک تصور یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اب اس تصور پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کبھی بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے کیونکہ وہ عبد، نوکر اور غلام بڑا ڈھیٹ اور بے شرم ہے جو اپنے مالک کے سامنے، اس کے دیکھتے ہوئے، اس کی موجودگی میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے جب کہ اس کو یہ بھی بتایا گیا ہو کہ جو خلاف ورزی بھی وہ کرے گا اس کو ریکارڈ کر لیا جائے گا، اس کے اپنے ہاتھ پر اس خلاف ورزی کی گواہی دیں گے اور پھر ایک دن اسے اس خلاف ورزی کا حساب دینا پڑے گا۔ اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے اللہ نے سخت سزا کا انتظام کر رکھا ہے اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتا ہے کہ اس سزا کو نافذ کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ان باتوں پر پختہ یقین رکھتا ہو تو وہ کیسے ان مٹیوں نوع کے تعلقات کے بارے میں دیئے گئے اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کا ایک اہم شعبہ عبادات کا ہے۔ عبادت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے اور اس کا بنیادی مقصد بندے کو اللہ سے جوڑنا ہوتا ہے تاکہ اللہ کو پانے کی جو پیاس اس کی فطرت میں رکھی گئی ہے اس کی تشفی ہو تاکہ اس کا تقرب اسے حاصل ہو، تاکہ بندہ اس کے احکام کی اطاعت کر کے اس کی رضا حاصل کر سکے اور یہ احکام چونکہ انسانی تعلقات کی محض ایک جہت (بندے کا اللہ سے تعلق) کا احاطہ نہیں کرتے (اگر عبادت سے صرف اتنا ہی مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ بندوں کو حکم دیتا کہ وہ گھروں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہیں اور غور و مراقبہ میں مصروف رہیں) بلکہ انسانی تعلقات کی مٹیوں جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں

لہذا اس نے عبادت کی شکل بھی اس طرح کی رکھی جس سے تینوں جہتوں کا احاطہ ہوتا ہو مثلاً نماز کی یہ شکل مقرر کی کہ محلہ کے مسلمان ایک مشترکہ جگہ (مسجد) میں دن میں پانچ بار جمع ہو کر اور مل کر اللہ کی عبادت کریں۔ ہفتے میں ایک معین دن (جمعہ) ساری آبادی جمع ہو اور سال میں دو بار معین دنوں میں (عید الفطر والاضحیٰ) سارا شہر جمع ہو کر عبادت کرے اور اس طرح کچھ معین ایام (ماہ حج) میں ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ (مکہ المکرمہ) جمع ہو کر عبادت کریں تاکہ وہ اللہ کا تقرب بھی حاصل کریں اور جو دیگر مقاصد نماز باجماعت سے مسلمان محلہ کی سطح پر حاصل کرتے ہیں وہ آبادی، شہر اور ملکوں کی سطح پر سارے مسلمانوں کو حاصل ہوں۔

نماز کے بعد زکوٰۃ کو لیجیے۔ اس کا بنیادی مقصد بھی یہ ہے کہ بندہ اللہ کا دیا ہوا مال اس کے حکم کے مطابق اس کی راہ میں خرچ کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرے لیکن اس سے یہ بھی مقصود ہے کہ مال کی محبت کم ہو تاکہ دنیا کی محبت میں کمی اور آخرت کی محبت میں اضافہ ہو، مال میں برکت اور افزائش ہو، غریب مسلمانوں کی مدد ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہی حال روزے اور حج کا ہے کہ ان عبادات کا بنیادی مقصد بندے کو اللہ سے جوڑنا ہے لیکن ان کی مشینری اللہ نے ایسی وضع کی ہے کہ اس سے تینوں جہتوں کی درستی کا کام لیا ہے چنانچہ شریعت میں کثرت عبادت و نوافل محمود ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے ساری رات عبادت سے منع کر دیا تاکہ اہل و عیال کے حقوق ضائع نہ ہوں اور انسان کے اپنے نفس کا حق ضائع نہ ہو (کہ آرام کرنا اس کا حق ہے)۔ مسلسل روزے رکھنے سے بھی آپ ﷺ نے منع فرما دیا کہ اس سے بندوں کے حقوق اور انسان کے ذاتی حق (آرام و صحت) کی نفی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شریعت نے عبادت کی جو شکل مقرر کی ہے وہ انسانی تعلقات کی تینوں جہتوں کو متوازن رکھتی ہے تاکہ کسی ایک تعلق پر اس طرح زور نہ دیا جائے کہ دوسری جہات غیر متوازن ہو جائیں۔ انسانی تعلقات کی ان تینوں جہات پر شریعت کے بتائے ہوئے متوازن طریقے سے جب عمل ہو تو شخصیت کا صحیح تزکیہ ہوتا ہے اور معیاری اور متوازن شخصیت پروان چڑھتی ہے۔

عبادت کی جو مثال ہم نے دی ہے اس کا انطباق ہم اخلاقیات اور معاملات پر بھی کر سکتے ہیں مثلاً اخلاقیات میں صبر کی مثال لیجیے۔ ایک شخص کا کوئی عزیز فوت ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہ شخص واویلا شروع کر دیتا ہے کہ وہ اجڑ گیا، لٹ گیا، بے وقت موت ہو گئی، اس کا کیا بنے گا؟ وغیرہ وغیرہ تو یہ اس شخص کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی خامی ہے کیونکہ ہر شخص کے مرنے کا اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، یہ ہر شخص کی تقدیر ہے، اس پر صبر نہ کرنا گویا اللہ کے حق کی نفی ہے، اس کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ یہ شخص اگر اس صدمے کو سر پر اتنا سوار کر لیتا ہے کہ اس کا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے یا نوکری چھوٹ جاتی ہے، وہ

لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور صبر نہیں کرتا تو یہ لوگوں کے ساتھ اس کے رویے کی غلطی ہے، اس میں اہل و عیال کے حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح مہینوں گزر جانے کے باوجود اگر اس کی یہ حالت ہے کہ وہ نہ وقت پہ کھاتا ہے، نہ نہاتا ہے، نہ صاف کپڑے پہنتا ہے اور صبر نہ کر کے اس صدمے کو اپنے اوپر طاری رکھتا ہے تو گویا وہ اپنی حرکتوں سے خود اپنے نفس کے حقوق کی بھی نفی کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہ اسلام کے مقرر کیے گئے اخلاق حمیدہ میں سے صبر کی صفت کو اپناتا تو اللہ کے، بندوں کے اور اپنے نفس کے حقوق ضائع نہ کرتا اور شریعت کے مقرر کردہ ایک حکم صبر کی خلاف ورزی کر کے اس نے انسانی تعلقات کی ان تینوں جہتوں کو غیر متوازن کر دیا۔

ایک مثال معاملات کی بھی سنئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جائز اور حلال طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے وہ ثواب کا حق دار ہے۔ صحابہ ؓ حیران ہوئے اور کہا کہ اس میں ثواب کی کیا بات ہے۔ یہ تو انسان کی اپنی خواہش ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ سوچو کہ اگر وہ اس خواہش کو حرام طریقے سے پورا کرتا تو؟ مزید غور کیجئے تو آپ ﷺ سمجھ جائیں گے کہ ایک فعل جو ایک شخص کا خالص ذاتی فعل ہے اس پر وہ ثواب کا حق دار اس لیے ہے کہ ایک شخص اگر کوئی فعل اللہ کے حکم کے مطابق کرتا ہے تو اللہ اس سے خوش ہوتا ہے اور اسے جزا اور انعام سے نوازتا ہے۔ یہ گویا اس ذاتی فعل کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق حق اللہ سے ہے۔ یہی عمل اگر کوئی شخص اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کرے گا تو مستوجب سزا ہوگا، اللہ کی ناراضی کا حق دار ٹھہرے گا۔ یہ اس معاملے کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ اب بندوں سے تعلق کے حوالے سے سوچیے۔ اگر کوئی شخص یہ فعل حرام طریقے سے کرے گا تو معاشرے میں فساد پھیلے گا، لڑائی جھگڑے ہوں گے، قتل و غارت ہوگی، معاملے عدالتوں میں جائیں گے، پیسہ خرچ ہوگا، اوقات ضائع ہوں گے، محنت ضائع ہوگی۔ غرض انسانوں کے حقوق کی تلفی کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ خود اس شخص کے ذاتی حقوق بھی ضائع ہوں گے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا، اگر وہ جیل جاتا ہے تو اس نے اپنی حماقت سے اپنے آپ کو تعذیب میں ڈالا، آرام، راحت، سکون سے محروم ہوا، اس کے پیسے بھی ضائع ہوئے۔ ممکن ہے وہ اس جرم کے بدلے میں قتل کر دیا جائے تو اس نے اپنے نفس کو بھی ضائع کر دیا اور آخرت میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوگا اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ معاملات کے سلسلے میں شریعت نے جو احکام دیے ہیں ان میں سے ایک کی مثال ہم نے دی کہ اگر وہ کام شریعت کے حکم کے مطابق کیا جائے تو تینوں جہتوں میں توازن وہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور انسان کا تزکیہ ہوتا ہے اور اگر وہ کام شریعت کے خلاف کیا جائے تو تعلقات کی یہ تینوں جہتیں بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔

ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات کی جو مثالیں ہم نے اوپر دی ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ہم دین کی تعلیمات پر صحیح طریقے سے عمل کریں تو انسانی تعلقات کی تینوں جہتوں کی متوازن طریقے سے نشوونما ہوتی ہے اور انسان کا مکمل تزکیہ نفس ہو جاتا ہے۔

**سوال:** تو ایمانیات اور عبادات کو بھی آپ تزکیہ نفس کا وسیلہ سمجھتے ہیں؟

**جواب:** ہم نے پوری تفصیل سے اپنا یہ نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ساری شریعت نفس انسانی کا تزکیہ کرتی ہے اور انسانی تعلقات کی تینوں جہات کی متوازن نشوونما کرتی ہے۔ آپ کے سوال میں جو بات رمز یہ طور پر موجود ہے اس کی صحیح تفہیم کے لیے دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

**ایک:** جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعت ساری کی ساری بشمول ایمانیات و عبادات نفس انسانی اور انسانی تعلقات کی تینوں جہات کا متوازن طریقے سے تزکیہ کرتی ہے تو اس سے ایمانیات و عبادات کی تحقیر کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کچھ لوگوں کو اس میں تحقیر کا غیر موجود پہلو بھی موجود نظر آ سکتا ہے لیکن اس کی وجہ ان کے تصور دین کا نقص ہے نہ کہ ہمارے نقطہ نظر کی غلطی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ صدر اول میں تصوف کی ابتداء ہوئی ہی اس حوالے سے تھی کہ لوگوں کے دلوں میں دنیا کی محبت گھر کر گئی تھی اور فکر آخرت کم ہو گئی تھی چنانچہ رد عمل کے طور پر کچھ لوگوں میں کثرت عبادت کا ذوق اور سادہ زندگی گزارنے کا شوق ابھرا جن کو لوگ زہاد کہتے تھے۔ بعد میں یہ رویہ اس طرح پروان چڑھا کہ دین کے دوسرے شعبوں خصوصاً معاملات کے بارے میں دینی تعلیمات نظر انداز ہونے لگیں۔ ساتھ ہی بدقسمتی سے سیاسی نظام میں خرابی پیدا ہو گئی کہ علماء و صلحاء نظام حکومت سے الگ کر دیئے گئے اور انہوں نے مساجد و مدارس کو آباد کر لیا۔ اس صورت حال سے دین و دنیا میں تفریق کا غیر اسلامی تصور ابھرا اور معاملات کو لوگ دنیا داری سمجھنے لگے اور عبادات وغیرہ میں معاملات کا جو پہلو تھا وہ دب گیا، ورنہ قرآن و سنت اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں یہ تفریق موجود نہیں۔ مثال کے طور پر مسجد کے ادارے کو لیجیے۔ مسجد صرف نماز کی جگہ نہ تھی، منصب صدارت کا الیکشن بھی وہیں ہوتا تھا۔ جنگی ہیڈ کوارٹر بھی وہی تھی، ساری سیاسی مشاورتیں وہیں ہوتی تھیں حتیٰ کہ تفرق و ثقافت کا مرکز بھی مسجد تھی۔ لوگ اس میں صرف ذکر اللہ ہی نہیں کرتے تھے شعر گوئی اور لطیفہ بازی کی مجلس بھی جماتے تھے یہاں تک کہ سرور عالم M نے اپنی اہلیہ کو باز یگروں کا تماشا بھی صحن مسجد میں دکھایا۔ یہ ساری باتیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں لیکن آج یہ باتیں لوگوں کو اوپری لگتی ہیں اس لیے کہ ہم نے مسجد کا کردار بدل دیا ہے۔

یہ ایک مثال تھی اسی طرح ہر شعبے کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ہم صرف ایک صحیح حدیث اور پیش کریں

گے کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں صحابہ ؓ نے ایک آدمی کے بارے میں، جو محنت مزدوری میں کوشاں ومنہمک تھا کہا کہ کاش وہ اتنی محنت دینی کاموں میں کرتا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر وہ اپنے اہل و عیال کو حلال رزق بہم پہنچانے کے لیے یہ محنت کر رہا ہے تو وہ عبادت ہی کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دین اسلام نے اللہ کی عبادت کا کوئی ایسا طریقہ تجویز نہیں کیا جس سے انسانی تعلقات کی دوسری جہات کا توازن خراب ہو بلکہ دین کی جتنی بھی تعلیمات ہیں وہ زندگی کی ان تینوں جہات میں ایک توازن پیدا کرتی ہیں جس سے ایک متوازن شخصیت جنم لیتی ہے اور انسان کا مکمل تزکیہ ہو جاتا ہے۔

**دوم:** یہ بات بھی غلط فہمی کا سبب نہیں ہونی چاہیے کہ احکام شریعت کو تزکیہ نفس کا وسیلہ کہنا گویا ان کی فضیلت کو کم کرنا ہے کہ وسیلے کا درجہ ہدف اور مقصود سے کم ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تزکیہ وسیلہ ہے احکام شریعت پر عمل کرنے کا یعنی جتنا اچھی طرح شخصیت کا تزکیہ ہوگا اتنے ہی اچھے طریقے سے اعمال بجا لائے جاسکیں گے اور اس کے برعکس بھی صحیح ہے یعنی احکام شریعت وسیلہ ہیں تزکیہ کا یعنی جتنا اچھی طرح احکام شریعت پر عمل ہوگا اتنا ہی عمدہ تزکیہ ہوگا۔ اسی طرح احکام شریعت پر صحیح طریقے سے عمل ہدف ہے تزکیہ نفس کا اور اعمال شریعت بجالانے کا ہدف ہے اطاعت۔ اطاعت کا ہدف ہے اللہ کی رضا اور گو بظاہر اللہ کی رضا آخری ہدف لگتا ہے لیکن کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی ہدف ہے اللہ کی نعمتوں کے حصول کا۔ اور اگر اس کے برعکس سوچئے تو بھی صحیح ہے کہ تعلیم وسیلہ ہے تزکیہ کا، تزکیہ وسیلہ ہے، احکام شرعی پر عمل کا، احکام شرعی پر عمل وسیلہ ہے اطاعت کا، اطاعت وسیلہ ہے اللہ کی رضا کا اور اللہ کی رضا وسیلہ ہے اللہ کی نعمتوں کا۔ تو گویا یہ سارے ادارے بیک وقت وسیلہ بھی ہیں اور ہدف بھی۔ لہذا یہاں ہدف اور وسیلے کی بحث افضل و مفضول کی بحث ہے ہی نہیں، نہ اسے اس تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

**سوال:** تزکیہ نفس اور اس طرح کی دوسری اصطلاحات مثلاً احسان، تصوف، طریقت، حقیقت، سلوک وغیرہ میں کیا فرق ہے؟

**جواب:** تزکیہ نفس اور ان اصطلاحات میں فرق ہے جو ذیل میں واضح کیا جاتا ہے۔

**تزکیہ نفس:** جامع قرآنی اصطلاح ہے جس کا مفہوم ہم نے ابھی اوپر واضح کیا ہے۔ مختلف قسم کی غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے۔

**تصوف:** وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں نے حصول تزکیہ نفس کے لیے قائم کیا۔ اس کے دو عملی اہداف تھے: ایک مسلمانوں کو معصیت سے بچانا اور دوسرے ان کو اعلیٰ درجے کا مسلمان بننے میں مدد دینا۔

**احسان:** احسان کا ایک مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو بہترین اور احسن طریقے سے انجام دینا (یعنی

(Excellence) حدیث جبریل ♦ میں ہے کہ حضرت جبریل ♦ نے آنحضرت ﷺ سے پہلے پوچھا کہ ایمان کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے جواب میں اسلام کے عقائد گنوا دیے (یعنی توحید، رسالت وغیرہ)۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے اہم اعمال گنوا دیے (جیسے نماز، روزہ وغیرہ) پھر انہوں نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ (یعنی ان اعمال کو اعلیٰ اور احسن طریقے سے کیسے انجام دیا جائے؟) تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ (سارے) اعمال عبودیت (یعنی عبادات، اخلاقیات، معاملات وغیرہ) یہ تصور کرتے ہوئے بجالائے جائیں کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا (اگر یہ تصور نہ ہو سکے تو یہ کہ) اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ گویا اعمال عبودیت بجالاتے ہوئے ذات باری کا استحضار کہ ہم اس کے حضور حاضر ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ احسان تصوف کے عملی اہداف میں سے ہے کہ انسان اعلیٰ درجے کا مسلمان کیسے بنے؟

**طریقت طریق:** عربی میں راستے کو کہتے ہیں۔ اس سے مقصود ہے وہ راستہ جس پر چل کر نفس کا تزکیہ حاصل کیا جاسکے۔

**حقیقت:** اگر اعمال شریعت کی اس طرح تشریح کی جائے کہ ایک ان کی ظاہری شکل ہے اور دوسرے ان کی داخلی سپرٹ، تو حقیقت کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف شریعت کے ظاہری اعمال ہی نہ بجا لائے جائیں بلکہ ان کی داخلی سپرٹ بھی حاصل ہو مثلاً ایک تو نماز کے ظاہری اعمال (قیام، رکوع، سجود اور ان میں پڑھے جانے والے اذکار) ہیں اور دوسرے اس کی داخلی سپرٹ جیسے خضوع و خشوع اور منکرات و معاصی سے بچنا۔

**سلوک:** سلوک کے ایک معنی تو راستہ چلنے کے ہیں۔ اس صورت میں یہ طریقت کا مترادف ہوگا یعنی وہ سیدھا راستہ جس پر چل کر تزکیہ نفس کی منزلیں طے کی جاسکیں۔ اور اس کے دوسرے معنی برتاؤ، رویہ اور طرز عمل کے ہیں۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوں گے ”اپنے رویے اور طرز عمل کی اس طرح اصلاح کرنا کہ تزکیہ نفس حاصل ہو جائے۔“

ان اصطلاحات کی مختصر تشریح سے واضح ہو گیا کہ تزکیہ نفس ہی جامع، قرآنی اور قابل ترجیح اصطلاح ہے تاہم یہ دوسری اصطلاحات بھی چونکہ صدیوں سے مسلمانوں میں مروج ہیں اور ہماری علمی اور تہذیبی تاریخ کا ایک حصہ ہیں لہذا ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ان سے حساسیت برتنے کی کوئی ضرورت ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص ان اصطلاحات کی ایسی تشریح کرے جن سے انہیں شریعت سے متصادم یا اس کے مقابل کی کوئی چیز ظاہر کرے تو یہ سو فیصد خلاف واقعہ اور خلاف اسلام ہوگا اور یہ چیز ہرگز

قبول نہ کی جائے گی۔

**سوال:** جب شریعت تزکیہ نفس کے لیے کافی ہے تو پھر تصوف کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

**جواب:** یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے علم اصول تفسیر، علم تفسیر اور دیگر علوم القرآن کی کیا ضرورت ہے؟ یا احادیث کے ہوتے ہوئے علم اصول حدیث، علم اسماء الرجال اور علم جرح و تعدیل کی کیا ضرورت ہے، اور قرآن و حدیث میں جب احکام موجود ہیں تو علم فقہ اور اصول فقہ کی کیا ضرورت ہے؟ یا آنحضرت ﷺ کے زمانے میں دینی مدرسے نہیں ہوتے تھے لہذا آج دینی مدرسوں کی کیا ضرورت ہے؟ یا قرآن و سنت کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی کیا ضرورت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اصل بات یہ ہے کہ انسانی زندگی بڑی متنوع ہے اور انسان کو جزئیات تک میں اتر کر بڑی تفصیلی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر جو کتاب نازل فرماتے ہیں وہ بہر حال محدود ضخامت کی حامل ہوتی ہے۔ نبی جب تک زندہ ہوتا ہے وحی کی روشنی میں تفصیلی رہنمائی مہیا کرتا ہے لیکن وہ انسان ہے، فوت ہو جاتا ہے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

پیغمبر کی سنت، کتاب اللہ سے زیادہ تفصیلی رہنمائی مہیا کرتی ہے لیکن یہ تفصیلی جزئیات بھی بہر حال محدود ہوتی ہیں لیکن جہاں تک معاشرے کا تعلق ہے تو اجتماعی زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی رہتی ہے، تمدنی بولچھونیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں اسلامی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کیا جائے، نئی آراء قائم کی جائیں، نئے علوم ایجاد کیے جائیں، نئے ادارے قائم کیے جائیں۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ یہ کام اسلام کے منصوص اہداف کے حصول کے لیے کیے جائیں اور قرآن و سنت کی روشنی میں کیے جائیں۔ اس صورت میں یہ اسلامی ہوں گے اور اگر ان دو شرطوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ غیر اسلامی ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ تزکیہ نفس اسلام کا ایک منصوص ہدف ہے۔ اگر اس کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں کوئی ادارہ قائم کیا جائے، کوئی تفصیلات مرتب کی جائیں تو یہ اسلامی ہوں گی غیر اسلامی نہیں۔ ہاں اگر اس ادارے کا ہدف کچھ اور ہو اور اس کا منبع قرآن و سنت نہ ہو تو وہ غیر اسلامی ہوگا اور ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

**سوال:** لیکن جب آپ کہتے ہیں کہ شریعت کی تعلیمات تزکیہ نفس کے لیے کافی ہیں تو اب اگر کوئی شخص اپنے نفس کا تزکیہ کرنا چاہے تو آپ کو چاہیے کہ اسے کہیں کہ شریعت کی طرف رجوع کرو لیکن آپ کہتے ہیں کہ تصوف کی طرف رجوع کرو۔ کیا یہ غیر اسلامی رویہ نہیں؟



**جواب:** یقیناً ہمارا یہ ایمان ہے کہ صرف شریعت ہی نفس کا صحیح تزکیہ کر سکتی ہے اور تزکیے کے لیے صرف اسی کی طرف ہی رجوع کرنا چاہیے۔ اپنی اصل میں یہ بات نہایت محکم ہے اور اس میں کوئی جھول نہیں کہ تزکیہ نفس ہی شریعت کا ہدف ہے اور شریعت کے سارے احکام اس کا وسیلہ ہیں لیکن بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ہم خود رکاوٹیں کھڑی کر لیتے ہیں اور اس وسیلے کو استعمال کر کے اس ہدف کو حاصل نہیں کر سکتے۔ گویا قصور ہمارا ہوتا ہے کہ ہم وسائل کو استعمال نہیں کر سکتے کہ ہدف تک پہنچ سکیں نہ کہ وسائل کا کہ وہ غیر مفید ہیں اور نہ ہدف کا کہ وہ ناقابل حصول ہے۔

معاملے کو عام فہم بنانے کے لیے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ اچھی صحت ہم سب کا ہدف ہے اور اس کا وسیلہ ہے غذا۔ لیکن ایک شخص نے وقت بے وقت غیر مناسب غذا کھا کھا کر اپنے معدے کا ستیاناس کر لیا ہے۔ اب اسے بھوک ہی نہیں لگتی کہ وہ غذا کھائے اور اگر کھائے تو وہ جزو بدن نہیں بنتی کہ اچھی صحت کا ہدف حاصل ہو۔ اب قصور نہ ہدف کا ہے (کہ وہ تو قابل حصول ہے) اور نہ وسیلے کا (کہ صحیح غذا صحیح طریقے سے کھائی جائے گی تو اثر کرے گی) بلکہ قصور اس شخص کا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ غذا کھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس حالت میں اس شخص کو اچھی غذا کے میسر ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسے پھل، مکھن، گوشت جو کچھ بھی کھلایا جائے اسے کوئی فائدہ نہ دے گا۔ یہ غذا جزو بدن بنے گی نہ اسے صحت حاصل ہوگی۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ پہلے اس کے معدے کا علاج کیا جائے تاکہ وہ غذا ہضم کر سکے اور غذا جزو بدن بن سکے۔ یہی حال اخلاقی اور روحانی صحت کا ہے کہ تزکیہ نفس کا ہدف قابل حصول ہے۔ احکام شریعت اس ہدف تک پہنچنے کا موثر اور مناسب وسیلہ ہیں لیکن بعض لوگ اپنے نفس (شخصیت) کو بیمار بنا لیتے ہیں یا وہ بیمار ہو جاتا ہے (جس کے اسباب کئی ایک ہو سکتے ہیں مثلاً والدین کی طرف سے صحیح تربیت میں غفلت، غلط نظام تعلیم و تربیت، غیر موزوں ماحول، بری صحبت وغیرہ) جس سے وہ اس وسیلے کو استعمال نہیں کر سکتے یا کریں بھی تو اس کے موثر نتائج نہیں نکلتے۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ پہلے اس شخصیت کا علاج کیا جائے تاکہ وہ اس وسیلے کو موثر طریقے سے استعمال کرنے کے قابل ہو سکے۔ تصوف یہی کام کرتا ہے کہ وہ نفس (شخصیت) کا علاج کرتا ہے تاکہ وہ شریعت کے وسیلے کو استعمال کرنے کے قابل ہو جائے۔ گویا تزکیہ شریعت ہی کرتی ہے اور صرف وہی کر سکتی ہے۔ تصوف کا کام صرف یہ ہے کہ وہ شخصیت کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ احکام شریعت پر عمل کر سکے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص لاہور سے اسلام آباد جانا چاہتا ہے اور ریل کے ذریعے جانا چاہتا ہے۔ گویا اسلام آباد پہنچنا اس کا ہدف ہے اور ریل اس کا ذریعہ ہے لیکن اس کے پاس کرایہ نہیں کہ وہ ریل کا ٹکٹ خرید سکے۔ یا وہ خود بچوں کو سکول لے جاتا اور لے آتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں کوئی دوسرا

متبادل شخص موجود نہیں جو یہ کام کر سکے۔ گویا ریل کا ذریعہ استعمال کر کے اسلام آباد پہنچنے میں کچھ رکاوٹیں ہیں ورنہ ریل کے مستند ذریعہ ہونے میں کوئی شک نہیں کہ جولاہور سے اسلام آباد جانے والی ریل میں بیٹھے گا وہ (ان شاء اللہ) وہاں پہنچ جائے گا۔ اسی طرح تصوف کی حیثیت ان موانع کو دور کرنے کے ایک ذریعے کی ہے جو انسان کو شریعت کا وسیلہ استعمال کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ورنہ شریعت کے صحیح اور موثر وسیلہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ تصوف تو اس وسیلے کو موثر طریقے سے استعمال کرنے اور موانع کو دور کرنے کا ایک معالجہ ہے۔

اب جیسا کہ ہر عقل مند سمجھتا ہے کہ علاج ہر شخص کے لیے فرض و سنت نہیں ہوتا۔ جو شخص صحت مند ہے اسے علاج کی ضرورت نہیں اور جو بیمار ہے وہ جب تک علاج نہیں کروائے گا صحت مند نہیں ہوگا۔ اور ہر شخص اپنے بارے میں دوسروں سے بہتر یہ جانتا ہے کہ وہ صحت مند ہے یا بیمار اور اگر بیمار ہے تو معمولی مرض ہے یا مرض مزمن۔ اگر مرض معمولی ہے تو وہ معمولی پرہیز سے یا اپنے ذاتی علم کے مطابق چھوٹی موٹی دوا کھانے سے ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر مرض مزمن ہے تو ظاہر ہے کسی ماہر طبیب سے عرصے تک علاج کروانا پڑے گا۔ مطلب یہ کہ کوئی آدمی اگر شریعت کی تعلیمات پر اس طرح عمل کرتا ہے کہ اس کے مثبت نتائج اسے مل رہے ہیں اور وہ ان سے مطمئن ہے تو اسے کسی تصوف کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہ خواہش و کوشش کے باوجود دین کی تعلیمات پر موثر طریقے سے عمل نہیں کر سکتا یا معاصی میں مبتلا ہے اور ان سے باز نہیں آ سکتا تو اسے خارجی مدد ضرور لینا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور دینی تعلیمات پر موثر طریقے سے عمل اتنے عظیم الشان اہداف ہیں کہ ان سے محرومی کا ایک مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان سے محرومی اصل دین سے محرومی ہے۔

## ڈاکٹر علی شریعتی اور اسلام کا تصور انسان

۱- ہم نے ڈاکٹر علی شریعتی کا مضمون اسلام اور تصور انسان (Humanity and Islam) شوق سے پڑھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ پڑھ کر مایوسی ہوئی اور ہم نے ان کی فکر کو بھی، اس مضمون کی حد تک، مغرب گزیدہ پایا اور ہم نے محسوس کیا کہ چارلس کرزمن (Charles Curzman) نے اپنی تالیف "Liberal Islam" میں دیگر لبرل اسلامسٹوں یعنی مغرب سے مرعوب و متاثر دانشوروں کے مضامین کے ساتھ اگر اسے بھی شامل کیا ہے تو ٹھیک ہی کیا ہے کیونکہ اپنے اس لیکچر میں ڈاکٹر شریعتی اسلام کا صحیح تصور انسان پیش نہیں کر سکے بلکہ وہ مغربی لبرلزم سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور اسی پس منظر میں انہوں نے اسلام کے تصور انسان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲- ڈاکٹر علی شریعتی کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کا انسان کئی طرح کی جکڑ بندیوں میں محبوس ہے (بشمول مذہب اور اہل مذہب کی جکڑ بندی کے) اور اس کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان جکڑ بندیوں سے آزاد کرالے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ اس آزادی کا نتیجہ یہ نہیں چاہیے کہ وہ خود غرضی میں مبتلا ہو کر بندہ نفس بن جائے یا مادہ پرستی اختیار کر لے بلکہ دوسروں سے محبت اور ان کی خاطر ایثار ہی اسے حقیقی خوشی دے سکتا ہے اور اسے اعلیٰ درجے کا انسان بنا سکتا ہے۔

۳- ڈاکٹر شریعتی اپنے لیکچر کے آخر میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس میں جزوی سچائی موجود ہے یعنی جو انہوں نے کہا ہے وہ بڑی حد غلط نہیں ہے لیکن انہوں نے پورے سچ کا اظہار نہیں کیا اور پورے سوال کا سامنا نہیں کیا بلکہ پہلو بچا کر نکل گئے۔ انہوں نے نہ سچ کا اثبات کیا اور نہ غلط کا پوری طرح رد کیا جس کے لیے اب ہمیں قلم اٹھانا پڑا ہے۔

۴- اسلام کا تصور انسان یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا<sup>(۱)</sup> اور اسے شعور اور انتخاب (Choice) کی آزادی دی کہ چاہے تو وہ اپنے رب کو مانے اور اپنی زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزارے یا چاہے تو اپنے رب کو نہ مانے اور زندگی اپنی آزاد مرضی سے جیسے چاہے گزارے۔ انتخاب کی اس آزادی کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے<sup>(۲)</sup> اور اس میں اچھے اور برے دونوں طرح کے رجحانات رکھ دیے ہیں<sup>(۳)</sup> اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ کس رجحان کو اپناتا اور اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

۱- البقرہ ۲: ۲۱

۲- البقرہ ۲: ۳۰

۳- البقرہ ۹۱: ۸

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ بھی فرمایا کہ ہم نے موت اور زندگی کا یہ سلسلہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ دیکھیں کہ کون اچھے اعمال بجالاتا ہے<sup>(۱)</sup>۔ اور اس بات کو نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا کہ ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی سفید سلیٹ کی مانند کہ اس پر کچھ لکھا نہیں ہوتا اور اس پر کچھ بھی لکھا جاسکتا ہے) پھر یہ اس کے ماں باپ (اور ماحول) ہے جو اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتا ہے<sup>(۲)</sup>۔ (یعنی وہ توحید چھوڑ کر غلط راستے پر چل پڑتا ہے)۔ اللہ نے انسان کے ساتھ کائنات کو بھی پیدا کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اللہ نے کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے<sup>(۳)</sup>۔ اس نے انسان کو کائنات کا علم دیا ہے<sup>(۴)</sup> اور اسے اس کائنات سے عبرت حاصل کرنے کے ساتھ<sup>(۵)</sup> اس کے برتنے، استعمال کرنے اور اس کی تسخیر پر اسے ابھارا ہے<sup>(۶)</sup>۔

۱- ہود: ۷۰ ۲- فطرت پر پیدا ہونے والی حدیث ۳- البقرہ ۲۹: ۲۹

۲- البقرہ ۲: ۳۱ ۵- العنکبوت ۲۹: ۲۰ ۶- الاعراف ۷: ۳۲

۵- لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار و انتخاب کی یہ آزادی دے کر اسے شتر بے مہار کی طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ جاؤ جو چاہے کرتے پھر و بلکہ:

i- اس کے اختیار کے صحیح اور غلط اور اچھے اور برے استعمال کے نتائج سے اسے باخبر کیا ہے اور اسے بتایا ہے کہ تمہاری بہتری اس میں ہے، تمہاری فطرت کے مطابق یہی ہے، کائنات سے ہم آہنگ ہو کر زندگی گزارنے کا تقاضا یہی ہے، عقل کا صحیح استعمال یہی ہے اور درحقیقت اللہ نے تمہیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ تم اس کی عبادت و بندگی (پرستش و اطاعت) کا راستہ اختیار کرو<sup>(۷)</sup> اور اللہ کی بندگی کو چھوڑ کر اپنی مرضی سے زندگی گزارے کا غلط فیصلہ نہ کرو<sup>(۸)</sup>۔ اور اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اول الذکر فیصلے کا نتیجہ ہے دنیا اور آخرت کی بھلائی<sup>(۹)</sup> اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے<sup>(۱۰)</sup> اور ثانی الذکر کے نتیجے میں دنیا میں تنگی ترشی کے ساتھ<sup>(۱۱)</sup> مشروط طور پر کچھ کامیابی اور آسائشیں بھی مل سکتی ہیں<sup>(۱۲)</sup> لیکن آخرت میں بہر حال اللہ کی ناراضی اور جہنم کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا<sup>(۱۳)</sup>۔

۷- الذاریات ۵۱: ۵۶ ۸- ص ۳۸: ۲۶ ۹- الاحزاب ۳۳: ۷۱

۱۰- آل عمران ۳: ۱۸۵ ۱۱- طہ ۲۰: ۱۲۴ ۱۲- یونس ۱۰: ۷۲

۱۳- الاعراف ۷: ۱۷۳

یہاں ایک لطیف نکتہ ہے ان لوگوں کے لیے جو عربی جانتے ہیں (کہ اللہ نے اپنا آخری پیغام عربی زبان ہی میں نازل کیا ہے) کہ انسان کو خیر اور شر میں انتخاب کی آزادی کے لیے جو لفظ اختیار کیا یا خیر عربی میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا مادہ بھی خیر (خ ی ر) ہی ہے گویا اختیار کا مطلب ہی اختیار خیر ہے..... یا ہونا چاہیے، نہ کہ اختیار شر۔

ii- اللہ نے اختیار خیر کا بیج انسان کی سرشت میں اور آج کل کی اصطلاح میں انسان کی جین (gene) میں رکھ دیا ہے لہذا اللہ کا تصور ہر انسان کی فطرت میں built in موجود ہوتا ہے (۱۴) یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت، خواہ وہ پوری طرح اللہ کی مسلم نہ بھی ہو، اللہ کا تصور ضرور رکھتی ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی ایک تحقیق کے مطابق دنیا کے ۵.۷۷ فی صد انسان کسی نہ کسی صورت میں اللہ کا تصور رکھتے ہیں (۱)۔

۱۴- الاعراف ۷: ۱۷۳

۱- انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا ایڈیشن ۱۹۹۸ء

iii- اللہ نے انسانوں کو انتخاب کی اس آزادی کے صحیح استعمال میں مدد دینے کے لیے ہر زمانے میں ہر قوم کے لیے پیغمبر اور نبی بھیجے کا اہتمام کیا (۲)۔ اللہ انسانوں ہی میں سے کسی ایک شخص کو جن لیتا ہے، اسے براہ راست ہدایت دیتا ہے اور پھر اس کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو صحیح راہ سے باخبر کرے (۳)۔

۲- الرعد ۱۳: ۷۷

۳- ابراہیم ۱۴: ۴۱۵

۶- گویا اللہ نے انسان کو باشعور بنایا ہے، اسے انتخاب کی آزادی دی ہے اور اسے کائنات کا علم دے کر اس کے استعمال (۳) اور اس کی تسخیر پر اسے ابھارا ہے۔ ان تین نکات تک تو ڈاکٹر شریعتی صاحب کی رسائی ہوگئی (انہیں قرآنی اصطلاح میں یوں کہا گیا ہے کہ انسان اللہ کا 'خلیفہ' ہے (۴)) لیکن اس کے بعد ڈاکٹر شریعتی کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ اللہ نے انسان کو اس کے انتخاب کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دینے کی خاطر اس کی رہنمائی بھی کی ہے اور صحیح انتخاب بتا بھی دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بشر صحیح معنوں میں انسان اس وقت بنے گا جب وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنے حق انتخاب کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنی آزاد مرضی سے دست بردار ہو کر اللہ کی غلامی کو قبول کر لے گا، اس کی کبریائی کو تسلیم کر لے گا اور اس کے مقابلے میں اپنے کمزور و حقیر ہونے کو بلا شرط و حدود اور بلا چوں و چرا تسلیم کر لے گا۔ قرآن اسے یوں تعبیر کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو عبد پیدا کیا ہے 'وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون' (۵) گویا اسلام کا تصور انسان یہ ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے۔ انسان کا یہ رویہ کہ وہ اللہ کا عبد ہے، واحد صحیح رویہ

ہے۔ انسان کا عبودیت کا یہ رویہ کیا ہے؟ قرآن و سنت نے اور علماء امت نے اس کی خوب وضاحت کر دی ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر اس میں دو اساسی تصور پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ پرستش کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور دوسرے یہ کہ اطاعت کی مستحق بھی صرف اللہ اسی کی ذات ہے۔

۴- البقرہ ۳: ۳۰

۵- الذاریات ۵۱: ۵۶

اللہ کی عبودیت کا یہ تصور اسلام کہلاتا ہے (۶) جو لغوی لحاظ سے بھی صحیح ہے اور اصطلاحاً بھی۔ اور جو انسان اللہ کی عبودیت کا یہ تصور قبول کر لیتا ہے، قرآن اسے 'مسلم' کہتا ہے (۷)۔ اور جو اس کا انکار کرتا ہے اور اللہ کی مرضی کی بجائے اپنی آرزو مرضی سے زندگی گزارنا چاہتا ہے اور خود یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اور خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ اسے قرآن منکر حق یعنی کافر کہتا ہے (۸)۔

گویا انسان کے لیے واحد صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبد بن جائے اور مسلم یکسو بن جائے (۹)۔ یہی اس کی منزل ہے اور یہی اس کی معراج ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑا کوئی آدرش نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے بڑی کسی کامیابی کا تصور۔

۶- آل عمران ۳: ۱۹ ۷- الحج ۲۲: ۷۸

۸- حمجدہ ۳۱: ۱۳-۵

۷- بشر کو انسان یعنی صحیح معنوں میں انسان بننے کے راستے میں جو رکاوٹیں اور جکڑ بندیاں حائل ہیں، ان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ مغرب کی غالب فکر و تہذیب کے زیر اثر آج کے انسان نے غلط چوائس کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس نے اللہ کی کبریائی کو رد کرتے ہوئے وحی کی حاکمیت کا انکار کر دیا ہے اور اپنی عقل کو (اور درحقیقت ہوائے نفس کو) اپنا رہنما مان لیا ہے اور اسے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا ہے کہ وہ طے کرے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ اور یہ کہ زندگی اسے کیسے گزارنی ہے۔ لہذا آج صحیح طرز فکر کے حامل اہل علم و فضل کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ آج کے انسان نے عقل کے نام پر جو یہ بے عقلی کی حرکت کی ہے، اسے اس کا احساس دلانے تاکہ وہ اپنی اس غلطی کے حصار سے باہر آ سکے۔

۸- اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معاشرے جو اپنے آپ کو مسلم کہلاتے ہیں، وہاں بھی آج کا انسان کئی طرح کی ایسی جکڑ بندیوں اور موانع میں محصور ہے جنہوں نے اسے عبودیت اور انسانیت کی منزل تک نہیں پہنچنے دیا، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

i- بہت سے لوگ صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں گویا محض معاشرتی ماحول کی وجہ سے ان کا نام عباد اللہ کی فہرست میں درج ہے جب کہ حقیقتاً وہ شعوری طور پر

مسلمان نہیں ہیں یعنی انہوں نے علم و اختیار کی بنیاد پر شعوری انتخاب سے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انہیں اللہ کی کبریائی کو تسلیم کر کے اس کی عبودیت کی زندگی گزارنی ہے۔

ii- جس درست رویے کا نام اسلام ہے، اس کے بنیادی ماخذ (یعنی قرآن و سنت) الحمد للہ آج بھی دنیا میں محفوظ و مامون موجود ہیں لیکن اسلام کے نام لیواؤں کی ایک بہت بڑی تعداد ان ماخذ سے غافل پڑی ہے، وہ ان سے استفادہ نہیں کرتی بلکہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان ماخذ سے استفادہ کرنے کی نہ صلاحیت رکھتی ہے نہ خواہش۔ بلکہ اسلام کے بہت سے نام لیوا ایسے ہیں جنہوں نے قرآن و سنت کی بجائے اپنے علماء و صلحاء کو معیار حق بنا رکھا ہے اور وہ ان کے فرمودات و اجتہادات کو ہی حرف آخر سمجھتے ہیں یا انہوں نے دیگر کئی طرح کے توہمات و تعصبات کو مشعل راہ بنا رکھا ہے۔

iii- اسلام کے بہت سے نام لیوا ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنا نام تو مسلمانوں کی فہرست میں درج کر رکھا ہے لیکن مغرب کی غالب فکر و تہذیب کے زیر اثر انہوں نے شعوری و فکری طور پر اہل مغرب کے فکر و عمل کو اپنا رکھا ہے جنہوں نے اپنی باگیں اللہ کی بجائے اپنی عقل و نفس کے حوالے کر رکھی ہیں۔  
صحیح طرز فکر و عمل کے حامل مسلم اہل علم و فضل علم کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ بھی ہے کہ وہ اسلام کے ان برائے نام پرستاروں کو سچا انسان اور سچا مسلمان بننے میں مدد دیں تاکہ ان کے فکر و عمل میں حقیقی تبدیلی جگہ پاسکے۔

۹- دوسروں کے لیے محبت اور ایثار بلاشبہ ایک صحیح انسان اور سچے مسلمان کے لیے ضروری ہیں لیکن یہ حق کے پورے پیکچر کا ایک معمولی جزو ہیں۔ یہ بلاشبہ جزو حق ہیں لیکن پورا حق بہر حال نہیں ہیں۔

۱۰- ہمارے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا صحیح تصور انسان یہ ہے کہ بحیثیت بشر، انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے اسے شعور عطا کیا ہے، اسے انتخاب کی آزادی دی ہے اور اس مادی کائنات کے استعمال و تسخیر پر اسے ابھارا ہے لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ باقی کا آدھا سچ یہ ہے کہ بشر کو انسان بننے کے لیے یہ درکار ہے کہ وہ اپنے انتخاب کا صحیح استعمال کرے جو یہ ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی آزادی سے دست بردار ہو جائے اور اللہ کی غلامی قبول کر لے۔ عبودیت کا یہ رویہ ہی بشر کو انسان بنانے کی کلید ہے۔ انسان اگر ایک اللہ کے سامنے جھک جائے تو پھر اسے کسی اور کے سامنے جھکنے کی حاجت نہیں رہتی بلکہ پھر ساری کائنات اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔ صحیح کہا تھا اقبال نے کہ۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لیکن اگر انسان غلط فیصلہ کرے اور اللہ کی عبودیت کو رد کرتے ہوئے عقل و نفس کا غلام بن جائے تو وہ دو ٹانگوں والے جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے اور اللہ جیسی رحیم و کریم و حلیم ہستی نے اسے گدھے اور کتے کی مثل قرار دیا ہے (۱)۔ غرض مسئلہ یہ نہیں کہ انسان محبوب ہے اسے آزاد کرایا جائے بلکہ حقیقت اس کے الٹ ہے کہ آج کا انسان آزاد بلکہ مادر پدر انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے فرمانروا بندوں میں شامل کرے اور نفس و شیطان کے شر سے محفوظ رکھے (آمین)

۱- الجمعہ ۶۲: ۵ والاعراف ۶۰: ۱۷

### استدراک

ہم نہ مفکر نہ فلسفی اور نہ دعویٰ علم و تحقیق۔ البرہان (.....) میں جب ہم نے آئن سٹائن کو انکار خدا پر طعنہ بے عقلی دیا تو ہمیں ڈرتھا کہ کوئی صاحب علم ہماری خبر لیں گے لیکن خاموشی رہی۔ اب ہم ڈاکٹر علی شریعتی پر نقد کر رہے ہیں تو اصحاب علم سے درخواست ہے کہ اگر وہ ہمارے موقف کو کمزور پائیں تو ہماری رہنمائی فرمائیں۔ البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆



ڈاکٹر علی شریعتی ☆ ترجمہ: ڈاکٹر محمد امین

## اسلام اور تصور انسان

آج ہم تصور انسان پر کچھ گفتگو کریں گے کیونکہ یہ تصور ماضی کے مقابلے میں آج زیادہ پیچیدہ اور غیر واضح ہے۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر آج تک دانشوروں، سائنسدانوں اور مفکرین نے انسان کے تصور پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن غموض فزوں تر ہی ہوا ہے۔ اس ضمن میں میرا بنیادی موقف یہ ہے کہ آج کا انسان کئی طرح کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور جب تک وہ ان زنجیروں سے آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ خود کو صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم یہ طے کریں کہ یہ زنجیریں کون سی ہیں اور انسان ان سے کیسے آزاد ہو سکتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم انسان کی تعریف کر لیں کہ انسان کہتے کسے ہیں۔

قرآن حکیم اس ضمن میں دو الفاظ استعمال کرتا ہے ایک بشر اور دوسرے انسان۔ سورہ مریم آیت ۱۰ میں ہے ”قل انما انا بشر مثلكم“ (اے نبی کہو کہ میں تو ایک بشر ہوں تم ہی جیسا) اور سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۱ میں ہے ”وكان الانسان عجولا“ (انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے)۔ بشر سے قرآن کی مراد دو ٹانگوں کی وہ مخلوق ہے جو طویل ارتقاء کے بعد ادب و بلین کی تعداد میں زمین پر پائی جاتی ہے جب کہ انسان وہ پیچیدہ اور غیر معمولی وجود ہے جس کے اوصاف فطرت کے کسی اور مظہر میں نہیں پائے جاتے۔ یہ ثانی الذکر شاعری، فلسفے اور مذہب میں زیر بحث آتا ہے جب کہ اول الذکر محض علم حیاتیات (Biology) کا موضوع ہے۔ یہ ’بشر‘ ایسی نفسیاتی، جسمانی اور حیاتیاتی خصوصیات رکھتا ہے جو انسانوں میں مشترک ہیں خواہ وہ گورے ہوں یا کالے یا پیلے۔ مغربی ہوں (یا مشرقی) مذہبی ہوں یا غیر مذہبی اور ان طبعی قوانین کے مطابق زندگی گزارنا ہے جو آج تک مختلف سائنسی علوم نے دریافت کیے ہیں جب کہ ’انسان‘ وہ ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں انسانیت کے بعض خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ گویا ہم سب ’بشر‘ تو ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب ’انسان‘ بھی ہوں یعنی بشر ہونا تو سب انسانوں کا مشترک وصف ہے لیکن ’انسان‘ ہونا امر دیگر ہے۔ بشر انسان ہو سکتے ہیں اور بعض ایسے بھی جو انسان بننے کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہوں۔

☆ ایران کے معروف دانشور اور فلسفی جو انقلاب ایران سے قبل وفات پا گئے تھے۔ ان کے لیکچر Humaunty and Islam کے عنوان سے چارلس کرزمن (Charlas Curzman) نے لبرل اسلام (Lobral Islam) کے عنوان سے اپنے مجموعہ مضامین میں شامل کیا ہے۔ اس مضمون پر ہمارا نقد بھی شامل اشاعت ہے۔ مدیر

اس لحاظ سے دوسری تمام مخلوقات کی طرح 'بشر ایک جسم نامی یا وجود (Being) ہے جب کہ 'انسان' بننا پڑتا ہے (Becoming)۔ انسان اس لحاظ سے دوسری تمام مخلوقات حیوانوں، درختوں اور بشر وغیرہ سے مختلف ہوتا ہے کہ انسان بننا پڑتا ہے جب کہ یہ تمام مخلوقات بنی بنائی ہوتی ہیں۔ دیمک کے سفید کپڑے کی مثال لیجیے وہ جس طرح کے گھروندے بناتے ہیں وہ لاکھوں سالوں سے ایسے ہی گھروندے بناتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ایسے ہی بناتے رہیں گے۔ یہی حال بشر اور دوسری مخلوقات کا ہے۔ ایک سائنس فکشن میں مصنف نے ایک سائنسدان کی زبانی اس بشر کا حال لکھا ہے وہ کہتا ہے:

زمین سے ایک سائنسدان مریخ کی سیر کو گیا وہ مریخ کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا کہ اسے ایک مقامی یونیورسٹی میں ایک کانفرنس کے بارے میں پتہ چلا جس میں ایک مریخی سائنسدان نے، جو زمین سے ہو کر آیا تھا، وہاں کے آنکھوں دیکھے حالات بیان کرنے تھے وہ سائنسدان روسٹرم پر گیا اور اس نے کہنا شروع کیا کہ:

'زمین پر زندگی پائی جاتی ہے۔ منجملہ دوسری مخلوق کے وہاں بشر پایا جاتا ہے۔ اس بشر کی شکل و شباہت میں کیسے واضح کروں کیوں کہ آپ کے ذہن میں اس کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یوں سمجھیے کہ جیسے ایک بھیڑ تھیلے میں بند ہو جس میں دو سوراخ ہوں۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور دو پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر بھرپور سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ بشر ایک دوسرے کو قتل کرنے میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے بہت سے گروپ جو جدید اسلحے سے لیس ہوتے ہیں، اپنے گھر بار اور دفاتر چھوڑ کر دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے گروپوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں حالانکہ بظاہر ان کا ان دوسرے لوگوں سے دشمنی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ شروع میں میرا خیال یہ تھا کہ یہ قتل و غارت گری حصول خوراک کے لیے ہے لیکن پھر میں نے دیکھا کہ ایک گروہ نے دوسرے کو قتل کیا اور بغیر کسی چھینا جھپٹی کے چلا گیا۔ بشر میں خودکشی کا رجحان بھی پایا جاتا ہے تاہم ان کی زیادہ قوت ایک دوسرے کو بلاوجہ قتل کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے گوشت اور خون کی ضرورت بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ خوراک دوسرے ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بے رحمی سے قتل کرنے کے بعد وہ فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنے ہیروز کے گن گاتے ہیں۔ خوراک کے حصول کے لیے بشر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ خوشبودار اور مزیدار پھلوں (اور سبزیوں) کو کھانے کی بجائے وہ گھر لے جاتا ہے اور آگ پر پکا اور بھون کر کھاتا ہے۔ نتیجتاً وہ بیمار ہو جاتا ہے اور معدے کی اصلاح کے لیے اسے ڈاکٹروں کی مدد لینا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پہ ڈاکٹر بہت امیر ہوتے ہیں اور معزز بھی گردانے جاتے ہیں۔ اگرچہ بشر کو زمین پر غلبہ حاصل ہے تاہم اس میں ایسی ہیہیت پائی جاتی ہے جو زمین کے کسی اور جانور میں

نہیں پائی جاتی۔“

سطور بالا میں بشر کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ شرمناک ہونے کے باوجود بڑی حد تک صحیح ہے۔ اگر ہم انسانی تاریخ..... میرا مطلب ہے انسانی حماقتوں کی تاریخ..... کا مطالعہ کریں تو وہ اس سے زیادہ طویل اور دلچسپ ہے جتنی انسانی مثبت حاصلات کی تاریخ۔ بشر وہ ہنדר (حیوان) ہے جس میں صدیوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی اس کی خوراک، لباس اور ہتھیار ضرور بدلے ہیں لیکن اس کے خصائص وہی پرانے ہیں۔ جنگلی قبائل کے سردار چنگیز خاں (منگول فاتح ۱۱۶۲-۱۲۲۷ء)، ماضی کے ’مہذب‘ معاشروں کے عالی مرتبت شہنشاہوں اور آج کی ’مہذب‘ دنیا کے ’معزز‘ حکمرانوں کے مابین کوئی خاص فرق نہیں پسوئے اس کہ چنگیز خاں نے سیدھے سبھاؤ یہ کہہ دیا تھا کہ میں قتل کرنے آیا ہوں جب کہ آج کی ’مہذب‘ دنیا کے حکمران [جھوٹ اور منافقت سے کام لے کر] یہ کہتے ہیں کہ ان کے پیش نظر تو امن کا قیام ہے۔ گویا صرف پیرایہ اظہار بدلا ہے ورنہ جھوٹ، عدم مساوات، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری تو پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ یہ ہے بشر۔

تاہم انسان کچھ آئیڈیلز رکھتا ہے اور بعض خوبیاں وہ اپنانا چاہتا ہے جو بشر میں نہیں پائی جائیں۔ بشر سے انسان بننے کا یہ سفر لامتناہی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

قرآنی آیت ایک پورا معاشرتی فلسفہ رکھتی ہے۔ اگرچہ صوفیاء وصول الی اللہ میں یقین رکھتے ہیں لیکن آیت میں لفظ الہ (اس کی طرف) استعمال ہوا ہے نہ کہ فیہ (اس میں) گو منصور حلاج (۸۵۷-۹۲۲ء) واصل بحق ہونے کا مدعی تھا جس کا مطلب یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ذات باری مقید بمکان ہے جب کہ حقیقتاً وہ ذات غیر فانی، ازلی اور ماورائے زمان و مکان ہے۔ یہی چیز انسان کے اللہ کی طرف سفر کو لامتناہی بناتی ہے اور اسی سے بشر کے انسان بننے کی بات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

انسان میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں: ۱- شعور ذات ۲- چوائس یعنی انتخاب و اختیار کی صلاحیت اور ۳- مانتخلیق کی صلاحیت)۔ انسان کی باقی ساری خصوصیات کا منبع یہی تین اوصاف ہیں اور ہم اتنے ہی انسان ہوتے ہیں جتنی ہم میں یہ تینوں خصوصیات ہوتی ہیں۔ جب ہمیں انسان کے بنیادی اوصاف کا پتہ چل گیا تو اب ہم ان عوامل کا پتہ چلا سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حصول کی راہ میں حائل ہیں اور ان رکاوٹوں کو دور کر کے ہم انسان بننے کے جبلی سفر کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ڈیکارٹ (فرانسیسی فلسفی ۱۶۵۰-۱۵۹۶ء) نے کہا تھا ’میں چونکہ سوچ سکتا ہوں اس لیے میں ہوں‘ گویا اس نے ہر چیز پر شبہ کیا سوائے اپنے موجود ہونے کے۔ اس نے اپنے سارے فلسفے کی بنیاد اسی

تشکیک پر رکھی۔ فرانسیسی دانشور آندرے گائیڈ (۱۹۵۱-۱۸۶۹ء) نے بھی اسی طرح کی بات کہی۔ اس نے کہا 'میں چونکہ محسوس کر سکتا ہے لہذا میں موجود ہوں' اور ایک تیسرے فرانسیسی مفکر البرٹ کیوس (۱۹۶۰ء-۱۹۱۳ء) کہا کہ 'میں بغاوت کر سکتا ہوں اس لیے میں ہوں'۔ یہ تینوں بیانات صحیح ہیں لیکن کیوس نے جو بات کہی ہے وہ زیر بحث موضوع کے حوالے سے اہم تر ہے۔

جب تک آدم جنت میں تھا اور اس نے گناہ نہیں کیا تھا وہ ایک فرشتے کی طرح جنت میں رہتا تھا جوں ہی اس نے گناہ کیا اور حکومت، وسعت نظری اور بغاوت کا پھل کھایا اسے جنت سے باہر پھینک دیا گیا تاکہ وہ زمین میں اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنے کی جدوجہد کرے۔ جس طرح والدین بچوں کے بڑے ہونے پر انہیں گھر سے نکال باہر کرتے ہیں تاکہ بقول جین پال سارتر (فرانسیسی فلسفی ۱۹۸۰-۱۹۰۵ء) وہ اپنی زندگی کا بوجھ خود اٹھائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیوانات کے برعکس، جو اپنی جبلتوں کے زیر اثر کام کرتے ہیں اور کوئی چوائس و اختیار نہیں رکھتے، انسان کو اپنی زندگی کا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ پس یہ انسان ہے جو شعور رکھتا ہے اور اس بناء پر جنت بلکہ خدا کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے یا اپنے اختیار کے استعمال سے اور اپنی مرضی سے خدا کی عبادت و پرستش کر کے مستحق نجات بن سکتا ہے۔ جو انسان بغیر کسی نیت اور ارادے کے اللہ اس کی عبادت کرتا ہے وہ اس حیوان کی طرح ہے جو بے بس ہے اور چوائس کا شعور نہیں رکھتا۔ گویا اطاعت اس شخص کی مطلوب ہے جو گناہ کر چکا ہو اور انسان کائنات کی واحد مخلوق ہے<sup>(۱)</sup>۔ جو انتخاب کی اہل ہے (اللہ کی اطاعت کا رویہ بھی انسان کی قوت انتخاب و اختیار کا ہی ایک مظہر ہے) کیوس کی 'بغاوت' کا یہی مطلب ہے خواہ وہ بغاوت کسی سماجی نظام کے خلاف ہو یا اپنی فطرت کے اور اس کے برعکس ڈیکارٹ اور گائیڈ کا یہ کہنا ہے کہ میں چونکہ سوچ سکتا ہوں اس لیے میں ہوں اور میں چونکہ محسوس کر سکتا ہوں اس لیے میں ہوں، محض اثبات وجود کے مظہر ہوں۔ اس وقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱- انسان اس کائنات کی واحد مخلوق ہوتی ہے جو شعور رکھتی ہے۔ اس شعور کی تین سطحیں ہیں۔  
۱- شعور ذات، ۲- شعور کائنات، ۳- فرد اور کائنات کے تعلق کا شعور۔ بشرائنا ہی انسان ہوتا ہے جتنا وہ ان تینوں باتوں کا شعور رکھتا ہے۔

۲- انسان صاحب اختیار ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی واحد مخلوق ہے جو فطرت، سماجی نظام اور اپنی فطری، جسمانی اور نفسیاتی احتیاجات کے خلاف بھی بغاوت کر سکتا ہے۔ انسان ان چیزوں کا انتخاب کر سکتا ہے جو نہ فطرت نے اس پر مسلط کی ہیں اور نہ جن کے لیے اس کی طبعی ساخت

موزوں ہے۔ یہ انسان کی عظمت کا ایک بڑا مظہر ہے جو اس کے علاوہ صرف خدا ہی کو سزاوار ہے۔ حیوانات تو مشینوں کی طرح ہیں جو محض اپنی جبلت کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ جیسے ایک بھیڑ میں سال میں ایک دفعہ جنسی جبلت جاگتی ہے جو ایک جبری اور مشینی عمل کی طرح ہے جس میں بھیڑ کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور جب اس جنسی بھوک کی تسکین ہو جاتی ہے تو بھیڑ اس کو اگلے سال تک اس طرح بھول جاتی ہے جیسے یہ موجود ہی نہ ہو۔

یہ صرف انسان ہیں جو اپنی فطری احتیاجات کے خلاف بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی 'خود غرض' فطرت کے باوجود خود کشی کر سکتے ہیں اور اپنے جسم و جان کے تحفظ کی جبلت کے باوجود اپنی جان دوسروں پر نثار کر سکتے ہیں۔ وہ پرسکون اور ہموار زندگی کے فطری داعیات کے باوجود بغاوت اور گناہ کی زندگی بھی گزار سکتے ہیں اور اس کے برعکس پاکیزہ اور زاہدانہ زندگی بھی گزار سکتے ہیں اس سب سے ظاہر ہے کہ انسان اختیار انتخاب رکھتا ہے۔

۳۔ انسانی فطرت میں یہ خدائی قوت موجود ہے کہ وہ چھوٹی بڑی ہر قسم کی تخلیق کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے برعکس جو یہ کہتے ہیں کہ انسان ایک ایسا حیوان ہے جو اوزار بنا سکتا ہے ہم کہتے ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت سے کہ وہ..... کے علاوہ بھی بہت کچھ بنا سکتا ہے۔

انسان کی قوت تخلیق اس وقت ابھر کر سامنے آتی ہے جب

اور ایک پر آسائش زندگی گزارنے کے سارے داعیان کے باوجود انسان بغاوت اور گناہ کر سکتے ہیں یا تقویٰ اور پرہیزگاری کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان واحد مخلوق ہے جو صلاحیت انتخاب رکھتا ہے۔

۳۔ انسان ایسی مخلوق ہیں جو چھوٹی سے لے کر بڑی اشیاء تخلیق کر سکتے ہیں اور یہ خصوصیت اس امر کی مظہر ہے کہ انسانی فطرت میں خدائی طاقت و دیعت کی گئی ہے۔ بعض لوگ انسان کو ایسا حیوان سمجھتے ہیں جو اوزار بنا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان اوزاروں سے بڑھ کر بھی بہت کچھ بنا سکتا ہے۔

انسان کی تخلیقی صلاحیتیں اس وقت ابھر کر سامنے آتی ہیں جب اس کی ضروریات اور خواہشات اتنی بڑھ جائیں کہ ان کا حل کائنات میں موجود نہ ہو۔ جب تک انسان اس پر قانع رہیں جو کائنات میں ان کے لیے مہیا ہے اس وقت تک ان کی حیثیت اس حیوان کی سی ہوتی ہے جو فطرت پر انحصار رکھتے ہیں لیکن جب ان کی ضروریات اور خواہشات فطرت کی طاقت اور خلاقیت سے بڑھ جائیں تو تنہا فطرت ان کی تسکین نہیں کر سکتی۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں جرمن فلاسفر جارجن ہائیڈیگر (۱۸۸۹-۱۹۷۶ء) کہتا ہے کہ یہاں پہنچ کر انسان تنہائی محسوس کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ وہ کس اور دس کا باسی ہے، اس مادی زندگی سے ماورا ہے اور دوسرے جانداروں سے بہر حال کوئی الگ قسم کی مخلوق ہے۔ اور ایسے آئیڈیلز انہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں جو فطرت میں وجود نہیں رکھتے مثلاً وہ اڑنا چاہتا ہے لیکن فطرت نے اسے پر نہیں دیے چنانچہ اس نے ہوائی جہاز، سٹیلائٹ سٹیشن اور خلائی جہاز بنانے شروع کر دیے۔

ٹیکنالوجی ان انسانی کوششوں کی خلاقیت کی مظہر ہے جو وہ فطرت کے سرکش گھوڑے کو لگام دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی مثال پٹرول کی ہے جو زیر زمین موجود ہوتا ہے لیکن انسان اپنے معمول کے ذرائع سے اس کے اخراج پر قادر نہیں۔ اس چیلنج کا جواب پٹرولیم انڈسٹری دیتی ہے جو زمین سے تیل نکالنے کی ٹیکنالوجی فراہم کرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان تین خصوصیات رکھتے ہیں، شعور ذات و کائنات، صلاحیت انتخاب اور قوت تخلیق۔ یہ تینوں صفات دراصل خدا کی ہیں اور انسان ان میں محض خدا سے مماثلت رکھتا ہے میں چونکہ شرک سے بچنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہ نہیں کہتا کہ انسان اللہ کی طرح یہ صفات رکھتا ہے بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ انسان ایسی مخلوق ہیں جو فطرت کے برعکس یہ خدائی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں اور مسلسل ترقی کرتے رہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا قول مبارک کہ 'تخلقوا باخلاق اللہ' ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں اللہ جیسے اخلاق اپنانے چاہئیں۔ مطلب یہ کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے جب کہ بشر بندروں کا خلیفہ ہے اور انہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو محدود شکل میں خدائی صفات اپنے اندر رکھتا ہے، مدرک شعور ہے اور صلاحیت انتخاب اور قوت بغاوت و تخلیق رکھتا ہے۔

اس وقت یہ حق انتخاب رکھنے والے بہت سی پابندیوں میں جکڑے ہوئے بلکہ کہنا چاہیے کہ بہت سی قیدیوں میں محبوس ہیں جو انہیں شعور ذات، حق انتخاب اور قوت تخلیق سے محروم کرتی ہیں۔ بد قسمتی سے اس وقت جو بدترین صورت حال انسانوں کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مختلف نظریات اپنے منہج کے مطابق انسان کو جو شعور ذات بخشتے ہیں اور انسانی سوسائٹی کو ترقی اور ارتقاء کے جس راستے پر چلاتے ہیں اتنا ہی وہ

انسان کو اس کی خودی سے محروم کرتے اور اس کی انسانیت کو گوشہ غفل میں دھکیلتے ہیں۔ ایسے نظریات میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

### ۱- مادہ پرستی (Materialism)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انسان مادے سے وجود میں آیا ہے اور مادی ارتقاء ہی سے موجودہ حالات تک پہنچا ہے۔ اگر ان کی رائے کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی مادی جکڑ بندیوں سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتا۔

### ۲- فطرت پرستی (Naturalism)

نظریہ فطرت اٹھارویں صدی میں منصہ شہود پر آیا اور انیسویں صدی کی ابتداء تک خوب پھیلا پھولا۔ اس کے مطابق کائنات کی اصل فطرت ہے اور وہی انسان کی خالق ہے۔ پس انسان اگر آزاد ہے، صلاحیت انتخاب رکھتا ہے اور اپنے آپ کو محسوس کر سکتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پرواز درحقیقت محدود ہے اور اتنی ہی ہے جتنی فطرت نے اسے عنایت کی ہے۔

### ۳- نظریہ وجودیت (Existentialism)

اگرچہ سارتر، ہائیڈیگر اور کرکی گارڈ (ولندیزی فلاسفر ۱۸۵۵-۱۸۱۳ء) کا نظریہ وجودیت لاندہی ہے تاہم ان کا، خصوصاً سارتر کا، خیال یہ ہے کہ انسان دوسرے جانداروں سے مختلف مخلوق ہے۔ سارتر اگرچہ خدا اور مابعد الطبیعیات میں یقین نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ انسان دوسرے حیوانات سے مختلف اور متضاد ہے۔ دوسری مخلوق پہلے پیدا ہوئی اور انسان بعد میں اور جب ہم کہتے ہیں کہ خدا نہیں ہے تو پھر ہمیں انسان کو اس مادی کائنات میں گھسیٹنا پڑتا ہے اور یوں ہم اسے ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ دیگر حیوانات اور انسانوں میں فرق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حیوانات میں جو ہر پہلے پیدا ہوا اور وجود بعد میں جب کہ انسان کا وجود پہلے پیدا ہوا اور جو ہر بعد میں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب میں ایک بڑھئی سے پوچھتا ہوں کہ وہ کیا بنا رہا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے کہ 'کرسی' اور جب میں پوچھوں کہ کرسی کیا ہوتی ہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ اس کے چار پائے ہوتے ہیں۔ ایک سیٹ ہوتی ہے..... وغیرہ۔ یہ چیزیں کرسی کا جو ہر ہیں جب کہ کرسی ابھی وجود میں آئی ہی نہیں۔

لیکن انسان کرسی سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے وجود کا ظہور تو پہلے ہو جاتا ہے لیکن وہ کون ہے اور

کیسا ہے؟ کا تعین کرنا بھی باقی ہے۔ گویا نظریہ وجودیت کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ انسان اپنے جوہر کا فیصلہ اور اس کا انحصار انسانی فیصلے پر ہے۔ خود کرتے ہیں کہ انہوں نے اسے کیا شکل دینی ہے۔ اسی وجہ سے سارتر یہ کہتا ہے کہ اگر انسان اپنے حق انتخاب کا استعمال نہیں کرتا تو وہ گویا انسان ہی نہیں ہے۔ اسی طرح سارتر اس خدشے کا بھی اظہار کرتا ہے، اور وہ اس میں حق بجانب ہے، کہ اگر ہم میٹرلیزم اور نیچرل ازم کو اساس تسلیم کر لیں، جیسا کہ ہم کیے ہوئے ہیں، تو یہ بھی انسان کے حق انتخاب کی آزادی کو مجروح اور متاثر کرنے والی بات ہے۔

#### ۴۔ نظریہ ہمہ اوست (Pan Hevsm)

ہمہ وقت کا نظریہ مذہبی پس منظر کا حامل ہے اور بعض مسلم صوفیاء، ہندو اور کیتھولک عیسائی اس میں یقین رکھتے ہیں یہ الہیاتی جبریت بھی انسانی حق انتخاب کو مجروح کرتی ہے۔ کیتھولک عیسائی کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو انسان کا حق انتخاب رکھنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی حوالے سے حافظ (مشہور فارسی شاعر ۱۳۹۰-۱۳۳۵ء) نے کہا تھا کہ منزل (تقدیر) کا تعین کرتے وقت چونکہ ہم موجود نہ تھے لہذا اگر ہم اس سے متفق نہ ہوں تو اسے کوئی بڑی بات ناسمجھا جائے۔

شاعر دراصل یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ جب ہم تخلیق کیے جا رہے تھے تو اُس وقت ہماری رائے تو لی نہیں گئی بلکہ اللہ نے جیسا چاہا ہمیں بنا دیا۔ بعد میں اس نے ہمیں زمین پر آزاد چھوڑ دیا (تو ہماری ذمہ داری کیا ہے؟) ایک اور شاعر نے حافظ کی پیروڈی کرتے ہوئے کہا کہ اب اگر ہماری حرکتیں تمہیں بدمزہ کرتی ہیں تو اس میں ہماری غلطی آخر کیا ہے؟<sup>(۱)</sup>

(۱) اردو ادب میں بھی اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جیسے غالب نے کہا تھا کہ.....

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے یہ ناسخ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اور اقبال نے کہا تھا کہ روز ازل مجھے علم سفر دیا تھا کیوں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ ایک طرح کی جبریت ہے لہذا اس پر ہمارا اعتراض بے محل نہیں۔ تقریباً ایسا ہی اعتراض کیوس (Camus) کا بھی تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تم کس کے خلاف احتجاج کر رہے ہو تو اس نے کہا 'خدا کے' پوچھا گیا کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا 'نہیں' سائل نے کہا جب تم ایسی کسی ہستی پر یقین ہی نہیں رکھتے جو کائنات کا انتظام چلا رہی ہے تو تم احتجاج کس کے خلاف کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا 'احتجاج تو مجھے کرنا ہے اگر کوئی متعین ہستی ایسی نہیں ہے تو احتجاج تو میں پھر بھی کروں گا۔'



یہ ہوا میں مکمل ہر آنے جیسی حرکت ہے کیونکہ اگر خدا فیصلے کرتے وقت اپنی مرضی کرتا ہے اور انسانی مرضی کا لحاظ نہیں کرتا تو یہ انسانی ذمہ داری کی نفی ہے اور اگر انسان ذمہ دار نہیں ہے تو وہ انسان ہی نہیں ہے۔

## ۴- تاریخت

اس مکتب کا خیال ہے کہ انسان تاریخ کی پیداوار ہے۔ میری شخصیت پر اسلام، شیعہ ازم اور ایران کے امنٹ اثرات ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں تاریخ میں اپنے حقیقی مقام کی بجائے فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں رہ رہا ہوتا تو میری بزبان، جذبات اور خصوصیات یقیناً مختلف ہوتے۔ کیا اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ انسان خصائص تاریخ کے مرہون منت ہوتے ہیں تو پھر میرے حق انتخاب کی کیا حقیقت رہ گئی۔ سوائے اس کے کہ جو تاریخ نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ اگر میں مسلمان ہوں اور فارسی بولتا ہوں تو یہ بھی ایک طرح سے تاریخ کا صبر ہے اور جس طرح سے فطرت طے کرتی ہے کہ میرے جسم کا رنگ کیا ہوا سی طرح تاریخ یہ طے کرتی ہے کہ میری فکر اور شخصیت کیسی ہو۔

## ۵- سماجی تحکم

اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ سماجی ماحول اور نظام انسان کی شخصیت گری کرتے ہیں۔ اگر میں بچی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جاگیر دار نہ پس منظر رکھتا ہوں اور اگر میں بہادر ہوں تو اس کا سبب یہ ہے کہ میں قبائلی پس منظر کا حامل ہوں جس میں میں پلا بڑھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سماجی نظام جو انسانوں کے باہمی تعلقات، ذرائع پیداوار، حقوق ملکیت، انتظامی ڈھانچے وغیرہ سے مل کر بنتا ہے، اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق ہماری شخصیت کو تشکیل دیتا ہے اور فرد، بحیثیت انسان، اپنی مرضی نہیں کر سکتا کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں یا یہ بننا چاہتا ہوں۔

## حیاتیاتی بالادستی (Biologism)

یہ مکتب فکر انسان کی تفہیم مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے ذرا بہتر انداز میں کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیسویں صدی کے سائنسدان سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تصور انسان کی مادہ پرست تفہیم سے اب مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس وہ انسان کے حیاتیاتی خصائص کو زیادہ اہم گردانتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود وہ انسان کو باشعور اور آزاد ہستی اب بھی تسلیم نہیں کرتے۔ جب میں اپنے

لاشعور اور حیاتیاتی قوتوں کا محکوم ہوں تو پھر ہمیں 'کہاں ہوں۔ ماہرین حیاتیات کہتے ہیں کہ موٹے آدمی شفیق ہوتے ہیں اور دبلے لوگ ذہین ہوتے ہیں۔ پس جب میرے ذہین یا شفیق ہونے کا انحصار میری جسمانی ساخت پر ہے تو اس میں میری مرضی کا دخل کتنا ہے؟

میں فطرت، معاشرے اور تاریخ کے اثرات کا انکار نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ ان عوامل کے باوجود انسان کی صلاحیت انتخاب باقی رہتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ عوامل اور ماحول انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر کچھ لوگ پہاڑی قبائل کی صورت میں رہتے ہیں تو اس میں ان کے انتخاب کو دخل نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح اگر کچھ لوگ خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں رہتے ہیں اور ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں تو یہ مخصوص سماجی اور معاشی حالات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ خصوصی فطری حالات کی وجہ سے جنگلوں میں رہتے اور شکار اور مچھلی پر گزارہ کرتے ہیں۔ دیہات کے لوگ اگر بڑے شہروں میں منتقل ہوں تو ان کے اخلاق و اقدار بدل جاتے ہیں اس تبدیلی میں ان کی مرضی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ مخصوص معاشی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان ویسا ہی بنتا ہے جیسے فطرت، تاریخ اور معاشرہ اسے بناتے ہیں اور اگر یہ عوامل تبدیل ہو جائیں تو انسان بھی تبدیل ہو جائے گا۔

اس سب کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ انسان اپنے ارتقائی مراحل میں، اور خصوصاً بشر سے انسان بننے کے پروسس میں، جبر کے ان عوامل پر غالب آ جاتا ہے مثلاً جغرافیائی اثرات کی مثال لیجیے کہ انیسویں صدی تک لوگوں کے ذہنوں پر اس کا اتنا غلبہ تھا کہ تیونس مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶ء) کی رائے یہ تھی کہ معاشرے جغرافیائی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں اور جغرافیائی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ یقیناً جب ابن خلدون نے یہ بات کہی تھی تو اس وقت وہ صحیح تھا لیکن آج یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ معاشرہ جتنا ترقی کرتا جاتا ہے جغرافیائی جبر سے آزاد ہوتا جاتا ہے۔

انسان فطری بندشوں سے کیسے آزاد ہو سکتا ہے؟ یہ سمجھنا آج آسان ہے کیونکہ موجودہ صدی میں ہم نے خود کو فطری بندشوں سے آزاد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج انڈسٹری اور جدید تہذیب نے ماضی کے مقابلے میں، زیادہ بہتر انداز میں انسانوں کو فطری پابندیوں سے آزاد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج افریقی صحارا میں بھی لوگ انہی جدید سہولتوں کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں جن سہولتوں کے ساتھ لوگ شمالی امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ کشش ثقل بھی اس فطری جبر کی ایک مثال ہے۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ یہ گویا ہمارے جسم کے لیے ایک ناگزیر حقیقت ہے لیکن اب ہم اس سے نجات پاسکتے ہیں۔ اسی طرح اب ہم مقامی زرعی پیداوار تک بھی محدود نہیں رہے۔ ماضی میں لوگ وہاں رہتے تھے جہاں پانی ہو، دریا ہوں اور

(نباتات و حیوانات کے لیے) جنگل ہوں اور ان کے بغیر زندگی ممکن نہ تھی لیکن آج لوگ صحرائیں بھی رہ کر جدید تمدنی سہولتوں کے ساتھ آرام سے زندگی گزار سکتے ہیں اور نئی تہذیب کو جنم دے سکتے ہیں۔

انسان ان بندشوں سے کیسے نجات پاسکتا ہے؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ فطرت کے جبر اور اس کے اصولوں اور خود پران کے اثرات کو سمجھ سکے۔ ان کا مطالعہ سائنس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ سائنس کے ذریعے ہی انسان ٹیکنالوجی ایجاد کرتا ہے اور اس ٹیکنالوجی کا ایک ہی بنیادی مقصد ہے کہ وہ خود کو فطرت کی پابندیوں سے آزاد کرا سکے۔ جو لوگ ٹیکنالوجی پر اس لحاظ سے تنقید کرتے ہیں کہ اس نے انسان کی ہیئت اور مزاج کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، ان کی بات بے وزن نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ٹیکنالوجی انسان کو (بہت سے نقصانات اور تباہی سے) بچا سکتی ہے مثلاً یہی دیکھیے کہ ماضی میں انسان کو خوراک اور لباس کے حصول کے لیے دن میں دس بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا اور یہ گویا تاریخ کا ایک جبر تھا لیکن ٹیکنالوجی کی وجہ سے پیداوار بڑھ گئی اور اب انسان کم وقت میں اور کم محنت سے ضرورت کی چیزیں حاصل کر سکتا ہے۔ اس پر اگر کوئی اعتراض کرے کہ آج بھی بعض لوگوں کو ماقبل ٹیکنالوجی دور سے بھی زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے تو اسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ..... طبقہ اپنا صرف خرچ..... بڑھاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے پیداوار مزید بڑھانا پڑتی ہے۔

(اب ہم فطرت کی بندشوں میں سے ہر ایک کو الگ زیر بحث لا کر آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح سائنس و ٹیکنالوجی ہمیں ان سے نجات دلانے میں کردار ادا کر سکتی ہے مثلاً یہ دیکھیے کہ ہم تاریخ کے جبر سے سائنس کی مدد سے کیسے نجات پاسکتے ہیں؟ اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ وہ کون سے اصول و ضوابط ہیں جو تاریخ کو کنٹرول کرتے ہیں اور وہ کیسے ہماری سوچ، خواہشات، جذبات اور اخلاق کو متاثر کرتے ہیں تو یقیناً ہم خود کو تاریخ کے جبر سے بچا سکتے ہیں۔ اس وقت ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ایسے کوئی معاشرے موجود ہیں جنہوں نے ایک ہی جست میں وہ تاریخی مراحل عبور کر لیے ہیں۔ جن سے معاشرے بالعموم یکے بعد دیگرے گزرتے ہیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اگر کوئی معاشرہ مختلف تاریخی مراحل کے حقائق کا شعوری ادراک حاصل کر لے اور اس کے آزاد فکر و دانشور ہر مرحلے کی ضروریات و مقتضیات کو سمجھ لیں تو ایسا معاشرہ یقیناً ہر مرحلے سے گزرے بغیر، ایک ہی جست میں کئی مراحل طے کر سکتا ہے۔ ہم نے عصر حاضر میں مشاہدہ کیا ہے کہ بعض قومیں جو غلام تھیں یا خانہ بدوش تھیں۔ وہ تاریخ سے بغاوت کرتے ہوئے ایک ہی..... میں بورژوائی مرحلے میں داخل ہو گئی ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے ممکن ہوا کہ وہ تاریخی جبر سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تاریخی جبر کی نوعیت، اس کی حرکت و ارتقاء اور اس میں کارفرما اصول و ضوابط کو سمجھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اسی طرح سماجی جبر کو لیجیے۔ ماضی میں فرد کا ارتقا معاشرتی تقاضوں کے مطابق ہوتا تھا لیکن آج فرد معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان تعلقات، سیاسی نظریات اور حکومتی معاملات کو جتنا سمجھتا چلا جاتا ہے اتنا ہی وہ ان کی بندشوں سے اوپر اٹھتا جاتا ہے بلکہ جرمن فلسفی کارل جاسپر (۱۹۶۹-۱۸۳۳ء) کے الفاظ میں 'معاشرہ جن لوگوں کی تشکیل کرتا ہے اب وہ معاشرے کی تشکیل نو کرتے ہیں' مثلاً ماضی میں خانہ بندوش، جاگیردارانہ معاشرے کے افراد اور پسماندہ دیہاتی اپنے مذہب، اقدار اور حکومت پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ ان کا صحیح ہونا بلکہ ان کا تقدس ان کے لیے اظہر من الشمس تھا۔ یہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان سے ہٹ کر مختلف زندگی گزار سکتے ہیں یا ان کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں لیکن آج کا انسان اپنی مرضی سے مذہب کا انتخاب کر سکتا ہے یا جس مذہب کو مانتا ہے اسے تبدیل کر سکتا ہے۔

مذہب بھی ایک ایسا معاملہ ہے جسے معاشرہ فرد پر مسلط کر دیتا ہے لیکن آج حالات بدل چکے ہیں۔ نظریات ملکیت، ذرائع پیداوار، معاشی نظام، سماجی و طبقاتی روابط، خاندانی حقوق و مراعات، اور سماجی گروپ بندی آج کے باشعور انسان کے لیے ماضی کی طرح ابدی، ناقابل تغیر اور وحی کی طرح مقدس نہیں رہیں بلکہ انسان کے لیے ایسی چیزیں بن گئے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ سکتا ہے، ان میں انتخاب کر سکتا ہے، انہیں بدل سکتا اور بہتر بنا سکتا ہے اور چاہے تو انہیں رد بھی کر سکتا ہے۔ یہ تبدیلیاں، اصلاحات بلکہ انقلابات اس بات کے گواہ ہیں کہ آج کا انسان تاریخ کے چنگل سے آزاد ہو چکا ہے۔ انسان کو یہ آزادی سماجی علوم اور سماجی نظاموں کے تقابلی مطالعے کی مرہون منت ہے۔ سائنس انسان کو ان عوامل کی قید سے مکمل نجات دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

آج کا انسان اگرچہ ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ با علم اور با صلاحیت ہے لیکن اس کے باوجود وہ نہیں جانتا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ وہ کیوں اپنے نفس کے پنجرے سے آزاد نہیں ہو سکتا؟ ماضی میں انسان کو ان جکڑ بند یوں اور اپنی محدودیتوں کا اندازہ تھا چنانچہ کھانے پینے اور زندہ رہنے کے لیے ابتدائی دور کا انسان جنگلوں یا دریا کے کنارے رہتا تھا تا کہ پانی، مچھلی اور جانوروں کا گوشت اور درختوں کے پھل اسے بآسانی میسر آسکیں لیکن نفس کی قید تو آدمی اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ مٹی کی دیوار کی طرح کی قید تو ہے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قید کا شعوری احساس کرنا اور اس سے مانوس ہونا مشکل ہے۔ یہاں قید اور قیدی اور مرض اور مریض دونوں ایک ہیں لہذا اس قید سے چھٹکارا محال ہے۔

ایک اور مشکل یہ ہے کہ آدمی سائنس کی مدد سے فطرت، تاریخ اور سماج کی جکڑ بند یوں سے نجات پاسکتا ہے لیکن سائنس کی مدد سے قید نفس سے نجات نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ سائنس تو خود انسان کی مٹھی

میں ہے لہذا نفس محسوس نہیں کرتا کہ اس کے اندر ایک آزاد 'میں'، دفن ہے۔ نفس یہ تو محسوس کرتا ہے کہ اسے تاریخ، فطرت اور سماج کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس آزادی کا مکمل کیا ہے؟ یہاں میں چند عمومی اصول بیان کرنا چاہوں گا:

۱- ہر انسان کی کچھ ضروریات ہوتی ہیں۔

۲- وہ ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور راحت محسوس کرتا ہے۔

۳- اس راحت کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

۴- یہ ناکامی اسے بغاوت پر ابھارتی ہے۔

۵- بغاوت کا نتیجہ رہبانیت اور داخلیت و موضوعیت کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ اصول انسانی زندگی میں ازل سے کارفرما ہیں اور آج کے بچے و جودی، ہماری ماضی کی اشرفیہ جو تصوف پر منتج ہوئی۔ ہندو جینی تہذیب کی سرنیت جو نروان کی صورت میں مادی زندگی کی نفی کرتی ہے اور مادی زندگی کی حقارت کرنا نیا بورژوائی نظام یہ سب میرے مذکورہ بالا عمومی اصولوں کی سچائی کی تصدیق کرتے ہیں۔ انسان اپنے مادی آئیڈیلز کو بہت اہمیت دیتے ہیں جب تک وہ پورے نہ ہو جائیں لیکن جوں ہی وہ پورے ہو جائیں ان کی اہمیت اس کی نظر میں ختم ہو جاتی ہے اور ایک خالی پن اس پر سوار ہو جاتا ہے لہذا انسانی آئیڈیلز ایسے بلند ہونے چاہئیں جو اسے بندگی اور مابوسی تک لے جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان اگر فطرت وغیرہ کی جکڑ بندیوں سے آزادی حاصل کر بھی لیں تو فاتح ہونے کے باوجود بے بس رہیں گے۔ اس بات کو فرانسیسی دانشور جین زولٹ (Jean/ Zoulet) (۱۸۵۴-۱۹۲۹ء) نے یوں کہا ہے کہ ایک مصنف نے اپنی کہانی میں لکھا ہے کہ ایک شہزادہ تھا جس کے پاس دولت کی ریل پیل تھی لیکن اس کے باوجود وہ ایک ناقابل علاج داخلی مرض میں مبتلا تھا۔ آج کے فرانس کی حالت بالکل اسی شہزادہ جیسی ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ آج کے انسان کی حالت اس شہزادے جیسی ہے اور بہت کچھ ہونے کے باوجود وہ بے بس ہے۔

بالینڈ میں روٹڑیم کے معروف چوک میں ایک دلچسپ مجسمہ ہے جس کے اعضاء اپنی اپنی جگہ پر نہیں ہیں مثلاً اس کی گردن پہلو کی طرف ڈھلکی ہوئی ہے، بازو اپنے جوڑوں سے اکھڑے ہوئے ہیں..... اور دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ مجسمہ ابھی گرنے والا ہے..... لیکن ظاہر ہے وہ پتھر کا بنا ہوا مضبوط مجسمہ ہے۔ دراصل مصور نے یہ مجسمہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بنایا تھا اور اس میں اُس نے یہ دکھایا ہے کہ

آج کا انسان گرچہ بظاہر چٹان کی طرح مضبوط ہے لیکن اس کے باوجود وہ گر کر تباہ ہونے والا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ آج کا انسان ماضی کی جکڑ بند یوں سے آزاد ہو کر اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ مرنے پر کمندیں ڈال رہا ہے اور فضاء کو مسخر کر رہا ہے تاہم ساتھ ہی وہ اتنا کمزور ہے کہ اگر تم اس کی تنخواہ میں ۱۲ ڈالر کا اضافہ کر دو تو وہ تمہارے ساتھ مل کر موجودہ مالک کے خلاف کام کرنے پر فوراً آمادہ ہو جائے گا۔

میں نے ایک دفعہ سنا تھا کہ افریقہ کے بعض علاقوں میں اب بھی غلامی کا رواج ہے۔ لوگ قدیم قبائلی لوگوں کو پکڑ لاتے ہیں اور کسی کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں، لیکن میں نے (متمدن اور مہذب) مغرب میں غلامی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور کیمبرج اور سو بورن میں دنیا کے بہترین دماغوں کی نیلامی ہوتے دیکھی ہے۔ امریکہ، یورپ، روس ہر جگہ سے بڑے بڑے صنعت کار آتے ہیں اور ذہین طلبہ کو خرید لے جاتے ہیں۔ وہ ان کو پرکشش تنخواہ کا، ڈرائیور، بنگلہ کی پیشکش کرتے ہیں اور طلبہ مقابلتا بہتر آپشن کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ غلامی ہی تو ہے۔ یہ کمپنیاں ان ذہین طلبہ کی مدد سے معاشرے کو فطرت اور تاریخ کے جبر سے تو بچا لیتی ہیں لیکن وہ خود اپنے نفس کے غلام ہوتے ہیں اور بے بس ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کر سکتے۔

جب آدمی سائنس کی مدد سے قید نفس سے آزاد نہیں ہو سکتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ اس کا جواب ہے محبت سے۔ لیکن محبت سے ہماری کیا مراد ہے؟ کیا صوفیوں والی محبت؟ جی نہیں! اس سے مراد ہے وہ الوہی قوت جو قلب انسانی کی گہرائی میں پائی جاتی ہے اور عقل و استدلال سے ماوراء ہے۔ صرف یہ نفس کی نظر نہ آنے والی دیواروں کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے اور نفس کے خلاف بغاوت کر سکتی ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ کام انسان اپنی عقلی اور استدلالی قوت سے کیوں نہیں کر سکتا اور اس کے لیے قید نفس کی ان دیکھی دیواروں کو جذب دروں سے جلانا ہی اس کا واحد حل کیوں ہے؟ تو اس کے جواب میں میں اطالوی دانشور اور ماہر سماجیات ولفریڈو پریٹو (Vilfredo pareto) ۱۸۴۸-۱۹۲۳ء کا یہ قول پیش کروں گا کہ انسانی اعمال و مسائل تین طرح کے ہوتے ہیں۔

۱- منطقی جیسے کھانا پینا، کام کرنا، مطالعہ کرنا، سوچنا..... وغیرہ۔

۲- خلاف منطقی جیسے کریمز اور منچلے لوگوں کی حرکتیں اور

۳- غیر منطقی اعمال جو نہ منطقی ہوتے ہیں اور نہ خلاف منطق۔

منطقی اعمال وہ ہوتے ہیں جو کائنات کے سلسلہ علت و معلول سے مربوط ہوتے ہیں اور ہم انہیں اپنی روزمرہ ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن انسان بسا اوقات اپنے مادی وسائل اور

خواہشات کو کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے قربان کر دیتا ہے خواہ اس کے بدلے میں اسے کچھ بھی نہ ملے مثلاً معاشرے کے وسیع تر فائدے کے لیے ایسے اعمال منطقی تو نہیں ہوتے بلکہ انہیں ایک لحاظ سے اخلاقی کہا جاسکتا ہے تو محبت وہ جذبہ ہے جو انسان کو اس بات پر اُکساتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے یا اپنے اعلیٰ تر آئیڈیلز کے لیے اپنے دنیاوی نفع نقصان سے بالاتر ہو کر سوچنے لگتا ہے۔

میں اگر آپ سے جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی مارکیٹ میں مجھ سے غلط بیانی نہ کریں۔ یا میں اگر باؤنس ہو جانے والے چیک نہیں لکھتا تو اس لیے کہ مارکیٹ میں میری شہرت خراب نہ ہو جائے۔ اس طرح کی چیزیں عقل و منطق پر مبنی اور ایک طرح کی کاروباری اخلاقیات یا مفاداتی نیکیاں سمجھی جاسکتی ہیں۔ تاہم اگر میں ایسا ہیچ بولتا ہوں جس سے میرا مادی نقصان ہوتا ہے یا جان چلے جانے کا خدشہ ہوتا ہے تو اس سے میرے اندر کا سویا ہوا انسان انگڑائی لے کر اُٹھتا ہے اور اس سے میرے وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے تو میرے اس فیصلے کا سبب عقل و استدلال نہیں بلکہ وہ بین اور محبت ہوتی ہے جو میرے اندر سونے ہوئے انسان کو جگا دیتی ہے۔

نطشے (۱۸۸۴-۱۹۰۰ء) ایک فرانسیسی فلسفی اور نابغہ عصر انسان تھا۔ اس نے جوانی کے غرور میں لکھا تھا کہ طاق سچائی ہوتی ہے اور طاقتور ہی سچا ہوتا ہے اور یہ کہ دوسروں کی مدد کرنا کمزوری کی علامت ہے اور کمزوروں کو تارخ بھلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ اس کے خیالات بھی بدلتے گئے اور پھر وہ محیر العقول واقعہ پیش آیا جو انسانی تاریخ میں ثبت ہو کر رہ گیا۔ ہوا یہ کہ وہ سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وزن کے بوجھ سے ریڑھی الٹ گئی ہے۔ کوچوان چابک مار مار کر گھوڑے کو کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور گھوڑا چابکوں کی مار سے اٹھنے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن ریڑھی کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ وہ سہا نہیں پاتا اور دوبارہ گر جاتا ہے اس دوران اس کی ٹانگ بھی زخمی ہو گئی ہے لیکن کوچوان پر غصہ سوار تھا۔ اس نے نطشے کی بات نہ سنی اور پھر گھوڑے پر پل پڑا۔ نطشے نے اسے کالر سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا میاں! ہوش کی دوا کرو۔ کوچوان نے غصے میں زور سے بوڑھے کو دھمکا دیا اور مارا۔ بوڑھا نطشے ان ضربات کو برداشت نہ کر سکا اور گھر پہنچنے تک اس کی روح قفسِ غصہ سے پرواز کر گئی۔

اس واقعے کو دو طرح سے دیکھا جاسکتا ہے: ایک یہ کہ نطشے ایک عظیم آدمی تھا جس نے ایک جانور کو ظلم سے بچانے کی خاطر جان دے دی۔ دوسرے یہ کہ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی کہ ایک گھوڑا تو بچ گیا لیکن انسانیت ایک نابغہ عصر دانشور سے محروم ہو گئی۔ نطشے کی یہ حرکت نہ تو منطقی ہے اور نہ خلاف منطقی بلکہ یہ غیر منطقی ہے۔ یعنی منطقی تجزیے سے ماوراء ہے اور اس کا تعلق اخلاق اور محبت سے ہے۔ جب ہم کسی سے

اس لیے محبت کریں کہ جواب میں وہ بھی ہم سے محبت کرے یا جب ہم کسی سے اس لیے حسن سلوک کریں کہ ہمیں اس سے کوئی کام ہو تو یہ تو کاروباری اخلاقی ہے۔ حقیقی محبت وہ ہوتی ہے جب ہم کسی مقصد کے لیے سب کچھ قربان کر دیں اور بدلے میں کچھ بھی نہ چاہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی اعلیٰ تر آئیڈیل ہو جیسے اپنی جان بھی قربان کر دینا تاکہ کسی کی زندگی بچ جائے یا کچھ اعلیٰ تر مقاصد حاصل ہو جائیں۔

غیر منطقی ماورائے منطق مرحلے کے بعد ایک چوتھا مرحلہ آتا ہے۔ اپنے آپ کو قربان کر دینے کا ہے یعنی ایثار کا اور یہ ایک ایسا تصور ہے کہ کسی اور زبان میں یہ لفظ ہی موجود نہیں۔ ایثار کا مطلب ہے دوسروں کو خود پر ترجیح دینا یا دوسرے لفظوں میں اپنے آپ کو دوسروں پر قربان کر دینا۔ یعنی اگر دو آدمیوں کو جان دینا ہو تو انسان کا یہ فیصلہ کرنا کہ وہ خود جان دے گا تاکہ دوسرا بچ جائے۔ ظاہر ہے یہ جاننے کے باوجود کہ اس میں اُس کی زندگی اور اس کی خواہشوں، لذتوں، خوشیوں، مالی مفادات غرض ہر چیز کا خاتمہ۔

پس سارے انسان ایثار کی قوت سے نفس کی قید سے آزاد ہو سکتے اور اس کی نظر نہ آنے والی خوفناک چار دیواری کو گرا کر اس سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ منطق و استدلال سے ماوراء وہ محبت ہے جس میں انسان دوسروں کی خاطر یا کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے اپنی ذات کی نفی کرتا ہے اور اپنے نفس کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔۔۔۔۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ایک آزاد انسان وجود میں آتا ہے اور جو کہ ایک انسان کے لیے اعلیٰ تر مقام ہے۔

خلاصہ یہ کہ آزاد پیدا ہونے والا، تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والا اور شعوری قوت سے خیر و شر میں انتخاب کی صلاحیت رکھنے والا انسان سائنس کی قوت سے فطرت اور تاریخ کے جبر سے خود کو نجات دلا سکتا ہے وہ سماجی علوم کی ترقی سے سماج کی جکڑ بند یوں سے بھی خود کو بچا سکتا ہے لیکن قید نفس سے نجات پانے کے لیے اسے بقول رادھا کرشن (بھارتی فلسفی ۱۸۸۸-۱۹۷۵ء) مذہب اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم انسان دنیا میں ایک مشن اور ذمہ داری دے کر بھیجے گئے ہیں جس میں انسان، خدا اور محبت مل کر ایک نئے انسان کی تخلیق کرتے ہیں اور ایک نئے اور آزاد انسان کی تخلیق ہی اس زندگی میں انسان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔



## اسلام اور ریاست سیکولرزم کو مطابق اسلام ثابت کرنے کے جاوید غامدی صاحب کے موقف کا ایک جائزہ

اسلام، مسلمان اور پاکستان دشمن قوتوں نے ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو اپنے گماشتوں کے ذریعے پشاور میں آرمی سکول کے بچوں کو بہیمانہ طریقے سے ذبح کرنے کا اشتعال انگیز واقعہ کرا کر اپنے بہت سے مقاصد حاصل کر لیے۔ کمزور اور مصلحت پسند سیاسی حکومت پر فوج کی تازہ دم، امریکی حمایت پر کمر بستہ اور سیکولر لیڈر شپ کو حاوی کر دیا۔ ملک کے سیکولر صحافیوں اور ادیبوں کو شہ ملی اور دینی قوتوں کو دیوار سے لگا دیا گیا۔ مدارس و مساجد پر چھاپے اور علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس طرح ’اسلامی انتہا پسندی‘ کے خلاف اور (۱) سکولرازم کے حق میں ایک بڑی لہر اٹھا دینے کے بعد سیکولرزم کو مذہبی حمایت دلانے اور دینی قوتوں کے خلاف مذہب کے نام پر ایک مضبوط آواز اٹھانے کے لیے حسب روایت جناب جاوید احمد غامدی سامنے آئے یا لائے گئے (۲) اور انہوں نے روزنامہ جنگ (شمارہ ۲۲ جنوری ۲۰۱۵ء) میں ’اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ‘ کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا ہے اور اب جمہور علماء اور سکالرز ان کو جواب دینے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ ان کے اٹھائے ہوئے مغالطوں کی حقیقت عوام و خواص کے سامنے لائی جاسکے۔

۱- سیکولرازم اگرچہ خود بھی ایک نظریہ ہے تاہم یہاں یہ ایک استعارہ ہے مغربی فکر و تہذیب کی نمائندگی کا اور اس میں ہیومنزم،

کیپٹل ازم، لیبرزم، نیشنلزم وغیرہ بھی شامل ہیں۔

۲- جس کی جب اسلام اور پاکستان مشکوک ثابت ہو چکی ہے۔

غامدی صاحب نے بہت سے نکات اٹھائے ہیں (اور یہ کوئی نئے نہیں ہیں، ماضی میں مصر کے علی عبدالرازق، عثماوی اور آیتہ اللہ طالقانی وغیرہ اسی طرح باتیں کرتے رہے ہیں اور صحیح الفکر علماء ان کو جواب بھی دیتے رہے ہیں جو ریکارڈ پر ہیں۔ بقول اقبال

اگر چہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اور مغرب کی الحادی فکر سے متاثر و مرعوب دانشوروں پر اپنی باتیں نئے سرے سے اور نئے آہنگ میں اٹھاتے رہتے ہیں اور مغرب زدہ و مغرب گزیدہ (اور اس کا خریدار ہوا) میڈیا اس کو اچھالتا رہتا ہے اور صحیح الفکر لوگ اس کو رد کرتے رہتے ہیں۔ دلیل کی یہ بازی اہل مغرب اور ان کے لی پالک باوجود مادی ذرائع کی کثرت اور اپنی طول لسانی اور وسیع پروپیگنڈا مشینری کے، وہ آج تک جیت نہیں سکے اور اسی لیے مغرب ہار کر توپ و تفنگ کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے کہ اس میں بہر حال اسے امت مسلمہ پر فوقیت حاصل ہے۔

بہر حال، ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ غامدی صاحب کے اٹھائے ہوئے نکات تفصیلی تجزیے کے مستحق ہیں اور ان پر، ان شاء اللہ، ہم قلم اٹھائیں گے لیکن آج کی نشست میں ایک تقابلی مطالعے کے ذریعے ہم مجملہ اپنے قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ:

۱- غامدی صاحب کا نقطہ نظر جمہور علماء و مسلمین کے موقف کے برعکس ہے۔

۲- یہ مغربی فکر و تہذیب کے عین مطابق ہے۔

۳- اور یہ کہ ان کے افکار عالیہ پر اگر عمل کیا جائے تو اس کے نتائج وہی نکلیں گے جو مغرب کی عین خواہش ہے کہ مسلمان معاشرے میں اسلام کی بجائے اس کے افکار و اصول و اقدار غالب آجائیں۔

حکیم خالد اشرف

## وحدت امت ہر فرد کی ذمہ داری

اختلاف مسائل کوئی نئی بات نہیں، اصحاب رسول میں بھی بعض مسائل میں اختلافات ہوئے، بعد کے ادوار میں بھی ایسا ہوتا رہا، لیکن اختلاف، اختلاف رائے تک ہی رہا۔ مخالفت کی نوبت کبھی بھی نہ آئی، کیونکہ ان اختلافات کو متعلقین نے نبی اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق قرآن حکیم اور فرامین نبوت کی روشنی میں حل کیا اور ادھر ادھر جانے کے بجائے، براہ راست ان دونوں (قرآن و حدیث) کی طرف رجوع فرمایا اور یوں امت میں کوئی دراڑ نہ پڑی۔

یہاں تک کہ ائمہ اربعہ کا دور آیا، ان کے دورِ سعید میں بھی ان مختلف فیہ مسائل کے ضمن میں کم و بیش وہی کیفیت رہی۔ باہمی رواداری میں سرِ موفرق نہ آیا اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی مصدقہ تحقیق کے مطابق یہ سنہرا دور ۴۰۰ سال تک قائم رہا اور مسلمان اس تقسیم اور بعد میں ہونے والی تقسیموں اور نسبتوں سے مکمل طور پر نا آشنا تھے۔ کسی امام کی فقہ پر کسی کو اصرار نہ تھا، کسی امام کے نام پر کوئی حد بندی نہ تھی، جبکہ ہر امام کے ہزاروں نہیں لاکھوں شاگرد اور معتقدین تھے۔ وہ ایسا اس لئے تھا کہ ان چاروں ائمہ کرامؒ کا فرمان تھا کہ میرے قول کے مقابلے میں اگر کوئی صحیح حدیث مل جائے تو اس صحیح حدیث کو پکڑ لو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔ ان کے شاگردوں نے ان ائمہ کرامؒ کے اس فرمان کو پلے باندھ لیا اور یوں اس اندھی تقلید کا دروازہ بند کر دیا، جس کے مظاہرے امت کے اندر غیظ و غضب کی صورت میں بعد میں دیکھے جانے لگے۔

ہوا یہ کہ ان ائمہ کرامؒ کے بعد اسلامی ممالک میں ان کے تعین فرماؤں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان فرماؤں نے بزور بازو اپنے اپنے امام کی فقہ مسلط کی تو اس امتِ واحدہ کی شکل و صورت ہی کچھ کی کچھ ہو گئی۔ ان ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے امام کی فقہ کے علاوہ دوسرے امام کی فقہ پر عمل کرنے والوں کو برداشت نہ کیا اور ان پر زبردستی اپنے امام کی فقہ ٹھونسنے کی کوشش کی، جو نہ مانا اسے پچل ڈالا۔

یوں امت واحدہ اور شجر اسلام، جس کی آیاری داعی اسلام ﷺ اور ان کے جانباز و جانثار صحابہ کرامؓ نے اپنا خون دے کر کی تھی اور اسے کوئی آٹھ نہ آنے دی تھی اور ائمہ کرامؓ نے اس رویہ کی پاسداری کرتے ہوئے اور اس کی بنیاد پر اس امت کو امت واحدہ بنا رکھا تھا، ان ظالم حکمرانوں اور اس وقت کے متعصب علماء نے اس امت کو نہ صرف ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بلکہ باہمی تشددانہ اور متعصبانہ رویوں کا زہر بھی امت میں گھول دیا۔ امت پہلے تو ان رویوں کی بنیاد پر ائمہ کرامؓ کے نام پر چار ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی اور شجر اسلام کو ان ظالموں نے کاٹ کاٹ کر آپس میں بانٹ لیا جو کہ اس امت کی بربادی کا آغاز تھا اور بڑا بھیا تک آغاز تھا اور یہی وہ بدقسمت لمحات تھے۔ جن میں اختلاف مخالفت میں ڈھل گیا اور پھر یہ اختلاف مسائل و فقہ کی بات نہ رہی، بلکہ امت باہمی مخالفتوں، جنگ و جدال اور ایک دوسرے کے غیظ و غضب کا شکار ہوتی رہی۔

اس کے بعد یہ امت جو تقسیم ہونا شروع ہوئی تو اس ہٹارے کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ سنی، شیعہ بریلوی، دیوبندی، چشتی، قادری، صابری، نظامی، اویسی، عطاری، وغیرہ وغیرہ..... ایسے ایسے عجیب و غریب نام اور نسبتیں سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں کہ الامان والحفیظ! ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے اور اب تو نوبت بایں جارسید کہ ہر امام مسجد اور خطیب مسجد کو ان کے نمازیوں اور معتقدین نے اتنا اونچا مقام دے دیا ہے اور ان خطباء و ائمہ مساجد نے خود کو ایسے مقام پر فائز کر لیا ہے کہ دین و مسائل کے حوالے سے وہ بذات خود ایک فرقہ اور گروہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ قبروں کے مجاور اور درباروں، مزاروں کی نسبتوں سے نام اور گروہ بن گئے۔ گو کہ اس حصہ گفتگو کی کہانی بڑی طویل، المناک اور اس کی چیرہ دستیوں بڑی خونچکاں ہیں، انہیں ہم کسی دوسری صحبت پر اٹھائے رکھتے ہیں۔

آئیے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، یہ تو اس المناک داستان کا ایک پہلو تھا، لیکن اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے، جو دراصل ہماری آج کی گفتگو کا اصل موضوع ہے، جو ان چیرہ دستیوں اور المناکیوں کی بھیا تک داستانوں میں ہمیں روشن راہیں دکھاتا ہے، وہ دلربا بھی ہے، ایمان افروز بھی اور یقیناً ہمارے لئے بڑی حد تک بہترین راہ عمل بھی ہے۔

ہم ماضی بعید کی بات نہیں کرتے۔ ماضی قریب میں روشن کرنیں ایسی ہیں کہ ان سے رات کے اندھیروں میں اجالا ہو جاتا ہے۔ وہ فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، میرالحدیث مولانا محمد ابراہیم میرسیالکوٹی، استاذ پنجاب مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحی لکھنوی اور اس دور کے ان گنت اکابرین الہمدیث و احناف ایسے ہیں جن کی مسلکی رواداری کے بیسیوں واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں باہمی الفت و محبت، رواداری، ایک دوسرے کی اقتدا میں نمازوں کا اہتمام، ایک دوسرے کے احترام و محبت میں آمین، رفع

الیدین، وتروں کے طریق ادا نیگی، دعائے قنوت، ایسے مسائل میں اپنے اپنے مسلک و موقف سے ہٹ کر دوسرے کے مسلک پر عمل پیرا ہونے اور باہمی رشتوں ناطوں تک کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ پھر احناف دیوبند کے جید عالم دین مولانا احمد علی لاہوریؒ جن کے ہزاروں مرید تھے، نے نماز عیدین کے پڑھانے کا اس وقت تک اہتمام نہیں فرمایا جب تک سرخیل الہمدیث خاندان غزنویہ کے چشم و چراغ امام سید محمد داؤد غزنویؒ نماز عیدین پڑھاتے رہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ اپنے مریدوں سمیت امام سید محمد داؤد غزنویؒ کی اقتداء میں ہی نماز عیدین ادا فرماتے رہے۔ مولانا احمد لاہوریؒ نے بزرگ الہمدیث عالم مولانا عبدالمجید سوہدرویؒ سے رشتہ داری بھی کی۔

احناف کے سرخیل مفتی محمد حسنؒ کے، خاندان غزنویہ سے الفت و مودت کے تعلقات تو روشن و آشکار تھے۔ ماضی قریب سے متصل حال کے احوال دیکھے جائیں، تو یہاں بھی کچھ ایسی ہی تائناک مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بھٹو کے ابتدائی دور کی اینٹی سوشلزم تحریک، تحریک تحفظ ختم نبوت (۱۹۵۳-۱۹۷۴)، تحریک استخلاص بھٹو (۱۹۷۷ء) میں تمام مسالک کے جید علماء کرام نے جس ملی، قومی اور مسلکی وحدت و یگانگت کا ثبوت پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بہت ہی مثالی تھا تو قطعی طور پر غلط نہ ہوگا۔ ان تمام تحریکوں میں علماء و مشائخ نے اپنے اور بیگانے کی تیز ختم کر کے یک جان ہو کر مثبت کردار ادا کیا۔

اینٹی سوشلزم کی تحریک میں جب مولانا احتشام الحق تھانویؒ فیصل آباد کی جماعت الہمدیث کی دعوت پر تشریف لائے تو جامعہ مسجد مبارک الہمدیث ٹنگمری بازار میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں استقبالیہ اس عاجز نے پیش کیا۔ بعد ازاں شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ، مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور دیگر حضرات نے خطاب فرمایا اور آخر میں خور و نوش کا سلسلہ چلا، اس تقریب کے اختتام پر مولانا تھانویؒ کو اباجی (مولانا عبدالرحیم اشرفؒ) نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، جسے انہوں نے بصد خوشی قبول فرمایا، بلکہ رات قیام کا عندیہ بھی دیا۔ جس پر اباجی بہت خوش ہوئے، اباجی نے چند دیگر علماء کرام کو بھی مدعو کر لیا جن میں مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا محمد صدیق، مفتی زین العابدین اور مولانا تاج محمودؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رات کھانے کے بعد عشاء کی نماز ہوئی، جماعت کے لئے یہ مقتدر علماء ایک دوسرے کو جماعت کروانے کا کہتے رہے۔ بلا آخر مولانا احتشام الحق تھانویؒ کو آگے کھڑا کر دیا گیا، مولانا تھانویؒ نے آمین بلند آواز میں کہی، رکوع و سجود، قعدہ، قومہ، جلسہ کا خاص اہتمام کیا اور بالخصوص انہوں نے رفع الیدین بھی کیا۔ ادھر مولانا محمد صدیق، مولانا محمد اسحاق چیمہ نے رفع الیدین نہیں کیا اور مفتی زین العابدین، مولانا تاج محمودؒ کو رفع الیدین کرتے دیکھا اور آمین کی آواز بھی سنائی دی۔ نماز سے فراغت کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس وقت کے سیاسی حالات

پر گفتگو ہونے لگی۔ بھٹو، سوشلزم اور دیگر مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، ان علماء کرام نے آئندہ کے حالات کے ضمن میں جن خدشات کا اظہار کیا، بعد میں وہ صحیح ثابت ہوئے۔

جب یہ حضرات اس گفتگو سے فارغ ہوئے تو میں نے موقع کو غنیمت جانے ہوئے مولانا تھانویؒ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کی: ”مولانا محترم! ابھی نماز میں آپ بزرگوں نے جو نقشہ پیش کیا، کیا یہ نقشہ گاہے بگاہے مختلف مقامات پر پیش نہیں کیا جاسکتا؟ تاکہ یہ خوشبو سدا بہار بن جائے۔ مولانا تھانویؒ ابھی اس سوال کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مفتی زین العابدینؒ مسکرائے اور بولے: آپ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور گردن سے دوپٹے ہیں۔ ابھی وہ مزید کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مولانا تھانویؒ بولے: عزیزم خالد صاحب! بات یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نے دیواروں کو مضبوط اتنا کر لیا ہے کہ انہیں گرانے کی ہمت جتنی چاہیے اتنی ہے نہیں۔ اباجی فوراً گویا ہوئے۔ ”اس کام کے لئے ہمت سے زیادہ جرأت رندانہ کی ضرورت ہے، اگر قائدین محترم جرأت سے کام لیں اور اپنے معتقدین کی ذہنی تربیت کریں اور اس کے ساتھ ساتھ عملاً گاہے بگاہے ایسے اقدامات کیے جاتے رہیں تو ان شاء اللہ بہت جلد حالات تبدیل ہو جائیں گے۔“

مولانا تھانویؒ بولے: ”اس مبارک کام کا آغاز آپ کے شہر سے ہونا چاہئے۔ مولانا سحاق چیمہؒ نے فرمایا: ”اس مبارک کام کا آغاز ہمیں سے ہوگا۔ ان شاء اللہ، مولانا محمد صدیقؒ فوراً اٹھے اور مولانا تھانویؒ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور ان سے بغل گیر ہوئے اور دیر تک بغل گیر رہے اور بولے: ”مولانا اسی تے جناب دے حکم دے تابع ہاں، جوتسی فرماؤ گے اسی حاضر ہاں۔ ویسے اس کم لئی مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ بڑے مناسب نہیں، کیونکہ اے وحدت امت دے بہت بڑے علمبردار نے، بلکہ انان دی زندگی دامن اے ہی اے، انان تے ہی ساری ذمہ داری پادلو، اسی سارے انان دے نال ہاں۔“ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں رواں ہیں، مولانا محمد صدیقؒ مولانا تھانویؒ کے بعد باری باری سب سے بغل گیر ہوئے اور آخر میں فرمایا: ”سب توں پہلے جامعہ مسجد اہلحدیث امین پور بازار توں اس مبارک کم نوں شروع کرو، میں مولانا اشرف نور خواست کراں گا کہ اوایدی تیاری کر لیں۔“

اباجی فرمانے لگے: وحدت امت کا مشن تو تمام اہل علم اور صاحب درد کا مشن ہونا چاہیے اور یہ ان کی ذمہ داری بھی ہے، میں اس کے لیے پہلے بھی حاضر تھا، اب بھی حاضر ہوں، آئندہ بھی رہوں گا، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے، بلکہ میری یہ خوش نصیبی ہے کہ اس مبارک کام کا آغاز میرے غریب خانے سے ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اس نشست اور اس اہم فیصلہ کے بعد کمر بستہ ہونے کی ضرورت ہے، مجھے ڈر یہ ہے کہ ہم جتنے سرگرم اس وقت ہیں، ہم خدا نخواستہ یہاں سے اٹھ کر اتنے ہی ٹھنڈے نہ پڑ جائیں اور اگر ایسا ہو گیا تو

شائد پھر ایسا موقع نہ ملے اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس تحریک کو پورے ملک میں آگ کی طرح پھیلا دیا جائے، تاکہ بروقت اور یک وقت اس مہم کا آغاز ہو جائے اور جو نتائج مطلوب ہیں، وہ ہم حاصل کر سکیں۔ میری بلکہ ہم سب کی مولانا تھانوی سے گزارش ہے کہ وہ اس موجودہ مہم (اینٹی سوشلزم) کے ساتھ ساتھ اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائیں اور وحدت امت کی تحریک کو تربیتی اور عملی طور پر لے کر چلیں اور جہاں تک ممکن ہو بریلوی مکتبہ فکر کے علماء اور عوام کو بھی ساتھ شامل کر لیں۔ اس بات کی تائید تمام مقتدرین نے فرمائی اور مولانا تاج محمود کی اس بات پر مجلس اختتام کو پہنچی۔ ”لگتا ہے اس پروگرام کو یہ باپ بیٹا دونوں پہلے ہی بنائے بیٹھے تھے، جو اس میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اس تحریکی مشن کو ہم سب پر مسلط کر کے چھوڑیں گے۔“

پروفیسر ملک محمد حسین

## فرد کی تعمیر اور سماجی تبدیلی چند عملی تجاویز

انسانی معاشرے کی اکائی فرد ہے۔ معاشرے کو تبدیل کرنا ہے اور اس تبدیلی کو حقیقی اور دیرپا بنانا ہے تو فرد کو تبدیل کرنا ہوگا۔ فرد کی تبدیلی تعلیم و تربیت سے ہی ممکن ہوتی ہے لہذا ہمیں تعلیم و تربیت کے نظام اور اس نظام کو روبہ عمل لانے والے تعلیمی اور تربیتی اداروں پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔

فرد کی تعمیر یا بالفاظ دیگر فرد کی تعلیم و تربیت سے حاصل ہونے والے مطلوب فرد کا ہمارا تصور یہ ہے کہ وہ

۱۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان (اقرار باللسان و تصدیق بالقلب) رکھتا ہو۔

۲۔ قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضوں کو سمجھتا ہو۔

۳۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی نظریہ حیات کے تقاضوں کو استطاعت بھر اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہو۔

۴۔ مسلمانوں سے خصوصاً اور تمام انسانوں کے لیے عموماً محبت، ہمدردی، رواداری اور مددگاری کا جذبہ رکھتا ہو۔

۵۔ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو نیز اقوام عالم اور ان کے مکینوں کے لیے بھی خیر کے جذبات سے لبریز ہو۔

۶۔ کامیاب اور پُرمسرت زندگی گزارنے کی صلاحیتوں اور مہارتوں کو اپنی استطاعت اور رجحان طبع کے مطابق حاصل کر چکا ہو۔

۷۔ زبان و بیان کی ایسی صلاحیتوں کا حامل ہو جن کو کام میں لا کر اپنے خیالات موثر طریقے سے دوسروں تک پہنچا سکے اور اس طرح اپنے نظریہ حیات یعنی اسلامی نظریہ حیات کی ترویج و ابلاغ کر سکے۔

ملک میں تعلیم و تربیت کے موجودہ وسائل

اس وقت وطن عزیز میں فرد کی تعمیر اور تعلیم و تربیت (اچھی یا بُری غلط یا ٹھیک) کے لیے جو ادارے کام



- کر رہے ہیں ان کا ایک اجمالی نقشہ اس طرح بنتا ہے
- (i) تین لاکھ سے زیادہ پرائمری، مڈل اور ہائی سکول ہیں۔
- (ii) پانچ ہزار سے زیادہ کالجز کام کر رہے ہیں۔
- (iii) ڈیڑھ سو سے زیادہ انسٹی ٹیوٹس اور یونیورسٹیاں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں روبہ عمل ہیں۔
- (iv) بیس ہزار سے زیادہ دینی مدارس دین کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔
- (v) تین لاکھ سے زیادہ مساجد میں جمعہ کے روز بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کے لیے خطبہ جمعہ کی شکل میں دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوتا ہے۔
- (vi) ایک سو سے زیادہ ٹی وی چینلز اپنی دیگر ابلاغی سرگرمیوں کے ساتھ تعلیم و تربیت عامہ کے پروگرامز بھی نشر کرتے ہیں۔
- (vii) سیکڑوں دینی رسالے شائع ہو رہے ہیں اور درجنوں روزناموں میں دینی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔
- (viii) فہم دین، درس قرآن اور درس حدیث کے نام پر ملک میں ہر روز ہزاروں نشستیں ہوتی ہیں۔
- (ix) کتاب میلوں میں جائیں تو نظر آتا ہے کہ سب سے زیادہ کتابیں دینی موضوعات پر شائع ہو رہی ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کا مذکورہ وسیع نظام ہونے کے باوجود افرادِ مطلوب تیار کیوں نہیں ہو رہے؟ جھوٹ، خیانت، چور بازاری، رشوت، نااہلی، ڈاکے اور راہ زنی، کرپشن اور بد انتظامی، دنگ فساد انتہا پسندی اور دہشت گردی کا معاشرے میں دور دورہ ہے۔ یہ درست ہے کہ معاشرے میں خیر کی قوتیں بھی موجود ہیں۔ نیکی اور شرافت کا چلن بھی نظر آتا ہے۔ صحیح سوچ اور درست نظریات کے حامل لوگوں سے معاشرہ خالی نہیں ہے لیکن معاملہ زیر دستی اور بالا دستی کا ہے۔ اول الذکر رویوں کے حامل لوگ معاشرے میں بالا دست نظر آتے ہیں جب کہ ثانی الذکر رویوں (ثبت اور اچھے رویوں) کے حامل لوگ کم ہیں اور بے بسی کا شکار ہیں۔

### اس صورتِ حال میں کیا کیا جائے؟

نئے سکول، کالج، یونیورسٹیاں، دینی مدارس اور ٹی وی چینلز کھولنے کی بجائے موجود اداروں کے لیے خیر اور اصلاح کا کام کیا جائے۔ اگر وسائل میسر ہوں تو رول ماڈل کے طور پر نئے سکول، کالج، یونیورسٹی، دینی مدارس اور ٹی وی چینل قائم کرنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے تاکہ ایسے ادارے وہ کچھ کر کے دکھائیں جس کا ہم خواب دیکھتے ہیں۔ ساتھ ہی موجود اداروں کے لیے راہنمائی کا کوئی انتظام کیا جائے تو مددِ ربی

مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے لئے ہماری فوری تجاویز حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سکولوں کے لیے خصوصاً اور اگر ہو سکے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے بھی ہم نصابی سرگرمیوں پر مبنی ایک تربیتی چیک تیار کیا جائے اور اداروں کے منتظمین کو اس امر پر مائل (Convince) کیا جائے کہ وہ مذکورہ چیک کو اپنے ہاں نافذ کریں۔ ضرورت ہو تو ان کی مدد اور رہنمائی بھی کی جائے۔

۲۔ تربیت اساتذہ کا ایک چیک تیار کیا جائے جس کے ذریعے سے اساتذہ کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے شاگردوں کے سیرت و کردار کی تعمیر کا کام اپنے روزمرہ اسباق کا حصہ بنائیں۔

۳۔ اسلامی نظریہ سے سرشار درسی کتب تیار کی جائیں اور جو ادارے ان کتب کو اپنے ہاں رائج کریں انہیں خصوصی پیشہ ورانہ معاونت مہیا کی جائے۔

۴۔ سوشل سائنسز میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے محققین کے لیے اسلامی تناظر میں تیار کیے گئے ریسرچ ٹاپکس (Research Topics) تجویز کیے جائیں اور ریسرچ گائیڈز کے طور پر کام کرنے والے یونیورسٹی پروفیسرز کے ذریعے ان موضوعات پر کام کروایا جائے۔ اس طریقے سے ایک طرف تو محققین میں اسلامی تحقیقی سوچ پیدا ہوگی اور دوسری طرف اسلامی تناظر میں تحقیق پر مبنی نیا علم مدون ہوگا جو آگے چل کر سوشل سائنسز میں لکھی جانے والی کتب کو لوازمہ فراہم کرے گا۔

۵۔ ٹی وی چینلز کو ایک طرف اس بات پر مائل کیا جائے کہ وہ کم از کم دینی اور تعلیمی پروگرامز میں کمرشل وقفے نہ کریں اور ساتھ ساتھ انہیں فاشی و عریانی پر مبنی پروگرامز اور کمرشلز سے اجتناب کی درخواست کی جائے۔ ٹی وی چینلز کو بہتر قسم کے تعلیمی، تربیتی اور دینی پروگرامز بھی تجویز کیے جائیں۔ خصوصاً بچوں کے لیے اسلامی کارٹون پروگرام۔

۶۔ جمعہ کے خطبات کے موضوعات اور ان کے لیے لوازمہ بھی تیار کیا جائے اور خطیب حضرات کو ان کے اساتذہ کے ذریعے اپروچ کر کے بہتر اور مفید انداز میں خطبہ جمعہ دینے کی درخواست کی جائے۔

۷۔ قصبات اور شہروں کی سطح پر بزرگ مقررین کی فہرستیں بنائی جائیں اور ان بزرگوں کے ذریعے سے سکولوں کی مارنگ اسبلی میں صبحی خطابات کا انتظام کیا جائے تاکہ بچوں کی اسلامی ذہنی تربیت ممکن ہو سکے۔

مندرجہ بالا تمام مجوزہ اقدامات پر عمل درآمد ترجیحات طے کرتے ہوئے تدریج کے ساتھ کیا جائے۔ میکرو لیول (Macro Level) کی بجائے مائیکرو لیول (Micro Level) پر کام کرتے ہوئے اور نتائج و مشکلات کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔

ایک اعلیٰ اسلامی تعلیمی ادارے کی ضرورت

جدید یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں درجاتِ تخصص کا قیام اور اسلامی علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا بندوبست وقت کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کی اہمیت اور فوری نوعیت کے بارے میں دورائیں نہیں ہو سکتیں۔ تخصص کے یہ مطلوب شعبے علوم القرآن، علوم الحدیث، فقہ و اصول فقہ، درس و تدریس اور تربیت، معاشیات، سماجیات، انسانیات، نفسیات، انتظامیات، سیاسیات، عالمیات ہیں جن پر اسلامی تناظر میں کوئی اطمینان بخش تعلیمی اور تحقیقی کام نہیں ہو رہا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ جدید و قدیم علوم میں آگے بڑھے بغیر ممکن ہی نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک اعلیٰ سطح کا اسلامی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کی تعلیم ہو اور جس کے نمایاں مقاصد حسب ذیل ہوں:

۱۔ بنیادی اسلامی علوم (تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اسلامی معاشیات) کے اعلیٰ مضامین کی تدریس کے لیے ایسے اساتذہ اور محققین کی تیاری جو ان مضامین کی اعلیٰ سطح پر کما حقہ تعلیم دے سکیں اور اعلیٰ تعلیم کے طلبہ (بشمول ماڈرن یونیورسٹیاں اور دینی مدارس) کو آنے والے چیلنجز اور خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر سکیں۔

۲۔ ایسے علمائے کرام اور فاضل محققین کی تیاری جو ملکی جامعات اور عصری تعلیمی اداروں میں عصری علوم خصوصاً سوشل سائنسز، ہرنس اینڈ کامرس، انتظامیات و سیاسیات کی تعلیم اسلامی تناظر میں دے سکیں۔

۳۔ ایسے اہل علم اور اصحابِ تخصص کی تیاری جو اسلامی علوم کے بارے میں پیدا کی جانے والی بدگمانیوں اور اسلامی عقائد و احکام کے بارے میں کیے جانے والے اعتراضات کا مدلل جواب دے سکیں۔

۴۔ ایسے اہل علم کی تیاری جو اپنی عمیق دینی مہارت کی بنیاد پر مغربی علوم و فنون کا ناقدانہ جائزہ لے سکیں اور مغربی افکار و تصورات کا اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں تنقیدی مطالعہ کر کے ان کے رطب دیا بس کو الگ کر سکیں۔

یہ ادارہ لازماً کل وقتی اور رہائشی ہوگا تا کہ طلبہ زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے سیکھنے اور تحقیق کرنے میں گزاریں۔ ڈگری کا حصول ثانوی مقصد ہوگا جب کہ علم اور صلاحیت کا حصول بنیادی مقصد قرار پائے گا۔ مذکورہ ادارے میں داخلہ صلاحیت، ذہانت رجحان طبع اور دلچسپی کی بنیاد پر ہوگا جس کا اندازہ معروضی آزمائشوں سے لگایا جائے گا۔ کسی طالب علم کی مالی استطاعت میں کمزوری کو رکاوٹ نہیں بننے دیا جائے گا۔ امید ہے صاحب ثروت حضرات و خواتین اس کارِ خیر میں کھلے دل کے ساتھ معاونت کریں گے۔ اگر تعلیم، تحقیق اور تدریس کی صلاحیتیں اور اتفاق فی سبیل اللہ کی طاقت یکجا ہو جائیں تو ان شاء اللہ یہ قدم اسلامی نشاۃ ثانیہ کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہوگا۔

## یہ سب کچھ کون کرے گا؟

ہمارے پاس تحریک اصلاح تعلیم کے حوالے سے ایک پلیٹ فارم موجود ہے اُسے مضبوط اور زیادہ فعال بنایا جاسکتا ہے نیز البرہان کے نام سے ایک ماہنامہ میسر ہے جس کے ذریعے سے اداروں تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ضرورت یہ ہوگی کہ لاہور کی سطح پر ایک کور کمیٹی بنائی جائے جو اس سارے کام کی منصوبہ بندی اور تنفیذ کی نگرانی کرے اور جوں جوں کام میں وسعت پیدا ہو مختلف علاقوں میں شہروں کی بنیاد پر ذیلی کمیٹیاں قائم ہوتی چلی جائیں۔ جہاں تک مالی معاونت کا تعلق ہے اگر کام کا آغاز کر دیا جائے اور کچھ ہوتا نظر آئے تو مالی معاونین میسر آجائیں گے، ان شاء اللہ

## پس تحریر

ڈاکٹر محمد امین صاحب صدر تحریک اصلاح تعلیم نے مجوزہ بالا ادارہ فوری طور پر قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ صاحب علم اور صاحب ثروت افراد سے دامے، درمے قدمے، سخی تعاون کی اپیل ہے۔ کیا کوئی ایسا صاحب دل فرد آگے بڑھ سکتا ہے جو اپنی کوئی خالی عمارت اس کا رخیر کے لیے وقف کر دے یا کوئی موزوں بلڈنگ خرید کر مجوزہ تعلیمی ادارے کو قلیل (Nominal) کرایہ پر طویل عرصے کے لیے لیز پر دیدے اور اس کے بدلے جنت الفردوس میں ایک عظیم محل کا امیدوار بن جائے؟









































































































































































































































































